نواب رنگیلے
مصنف ومصوّر
عابد سورتی
مترجم : خورشید عالم

نہرو بال پستکالیہ

نواب رنگیلے

مصنف و مصوّر

عابد سورتی

مترجم

خورشید عالم

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

بھائی للّو، ہو جا شروع

جنگ بہادر نواب رنگیلے کا نہ جنگ سے کوئی تعلق تھا نہ بہادری سے۔ اب ان کے تخت و تاج باقی تھے نہ حکومت۔ نگاڑاپور کی ریاست آزادی کے بعد ختم ہو چکی تھی، لیکن عوام اب بھی سلامت تھے۔ بزرگ لوگ آج بھی نواب رنگیلے کی عزت کرتے تھے... اور اس کی وجہ بھی تھی۔

کسی زمانے میں وہ ان لوگوں کے سرپرست رہ چکے تھے۔ کتنے دنوں کے لیے؟ یہ راز کی بات ہے۔ کوئی کہتا تھا، وہ سات دن کے سلطان تھے تو کوئی کہتا تھا، چھ دن کے۔ اصل میں جس روز انھوں نے سر پر تاج رکھا تھا، اسی روز ہندوستان کو آزادی ملی تھی، اور نواب کے دن ختم ہوئے تھے۔

نوابی کیا ختم ہوئی، وقت کے ساتھ سب کچھ بدل گیا۔ اب تو نواب رنگیلے ایک چھوٹے سے مکان میں اپنی رنگیلی بیگم کے ساتھ رہتے ہیں اور مرغیاں پالنے سے لے کر شیر مارنے تک کا، جو کچھ بھی کام مل جاتا ہے، کر لیتے ہیں۔ پھر بھی وہ دکھی نہیں ہیں۔ آج بھی وہ کمر پر زنگ لگی تلوار لٹکاتے ہیں اور منہ میں پان کی گلوری ٹھونس کر اپنی بہادری کے قصے سناتے رہتے ہیں۔

''اماں، کیا بتائیں... '' ایسے ہی وہ ایک روز بچوں کو شکار کا قصہ سنا رہے تھے، ''ننگی تلوار کے ساتھ ہم شیر کے پیچھے ایسے دوڑے کہ کبھی شیر آگے، تو کبھی ہم آگے... ''

''پھر کیا ہوا نواب صاحب؟'' کسی بچے نے پوچھا۔

''اماں، ہوتا کیا؟ شیر کی مجال کہ وہ ہم سے آگے نکل جائے! ہم اتنے دور نکل گئے کہ مڑ کر دیکھا تو شیر کہیں نظر ہی نہیں آیا۔''

سارے بچے کھلکھلا کر ہنس دیے۔

تبھی نواب رنگیلے کا دوست شیر سنگھ وہاں سے گزرا۔

''کیا بات ہے شیرا۔'' نواب نے اس کا ڈھیلا چہرہ دیکھ کر پوچھا، ''کہیں کسی چوہے کو دیکھ کر ڈر تو نہیں گئے؟''

''بات ہی کچھ ایسی تھی۔''

''کہو تو ہم بھی جانیں۔''

''میرے گھر پر ڈاکا پڑا ہے۔''

''کیا...؟''

''ڈاکو بھوت ناتھ میری تجوری صاف کر غائب ہو گیا ہے۔''

نواب رنگیلے نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا، ''تب رات میں ہمیں آواز کیوں نہ دی؟''

''کیسے دیتا؟ صبح میری آنکھیں کھلی، تبھی تو پتہ چلا۔'' شیر سنگھ نے بتایا، ''ویسے بھوت ناتھ نے رات میں تین گھر لوٹے تھے۔''

''جہاں بستی بزدلوں کی ہو وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''سچ! لیکن اس بستی میں ایک مرد بھی رہتا ہے۔''

''سو تو ہم ہیں ہی۔''

''اس لیے...'' شیر سنگھ اب اصلی بات پر آیا، ''پنچوں نے فیصلہ کیا ہے کہ بھوت ناتھ کو گرفتار کرنے آپ جنگل میں جائیں گے۔''

یہ سنتے ہی نواب رنگیلے کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ ڈاکو بھوت ناتھ کے نام سے آدمی تو کیا، درخت کا پتا پتا کانپتا تھا۔ پھر بھی نواب رنگیلے نے سینہ چوڑا کرتے ہوئے کہا، ''ہمارے سوا اور جا بھی کون سکتا ہے؟ آج ہی رات میں ہم جائیں گے، اور صبح تک اس کتے کی دُم پکڑ کر اسے گھسیٹتے ہوئے چوراہے پر لے آئیں گے۔''

''مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔''

''کیا؟''

''میرا مطلب، یہی امید تھی۔'' شیر سنگھ بولا، ''بھوت ناتھ کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر بچوں نے دس ہزار روپے انعام کا اعلان کیا ہے۔''

''دس ہزار روپے!''

سَو سَو کے سو ہرے نوٹوں کا خواب دیکھتے ہوئے نواب رنگیلے گھر لوٹے اور حقیقت سامنے آ گئی۔ حقیقت کیا تھی... ڈاکو بھوت ناتھ کا چہرہ تھا! کالا، بھیانک، بڑی بڑی آنکھیں، بڑی بڑی مونچھیں، لمبی لمبی ڈاڑھی اور کسا ہوا جسم۔ حقیقت یہ بھی تھی کہ آج تک کسی نے بھوت ناتھ کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

بیگم رنگیلی سے اپنے شوہر کی اداسی دیکھی نہ گئی۔ بولی، ''ہنستے ہنستے گئے اور چمگادڑ کی طرح چہرہ لٹکائے ہوئے آئے۔ کیا ہوا؟''

''بہت برا!''

''لیکن ہوا کیا؟''

''ڈاکو بھوت ناتھ...!''

''مارا گیا؟''

''وہ زندہ ہے، مارے تو ہم گئے!''

بیگم رنگیلی سمجھ گئی۔ نواب صاحب کے مزاج سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ ضرور شوہر میاں نے بھوت ناتھ کو گرفتار کرنے کا چیلنج قبول کر لیا ہوگا اور اسی وجہ سے اب افسوس کر رہے ہوں گے۔

''اوہ...'' آخر وہ بولی، ''تو یہ بات ہے! جناب والا آج رات بھوت ناتھ کو چیلنج دینے جا رہے ہیں؟''

''کیا ہماری عقل ماری گئی ہے کہ ہم اسے گرفتار کرنے جائیں گے؟'' کہتے ہوئے نواب رنگیلے نے صفائی دی، ''آخر ہمارا اس نے کیا بگاڑا ہے! کچھ بھی تو نہیں۔ شاید وہ بھی جان گیا ہے۔ اس گھر میں کسی کی دال نہیں گلتی۔ اس لیے اس نے ہمارے گھر کی طرف آنکھیں اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ کیا سمجھی؟''

''لیکن رات میں آپ جائیں گے یا...!''

''ابھی رات کافی دور ہے...!''

یہ کہنا تھا کہ آفتاب ڈھل گیا۔ جیسے جیسے اندھیرا گہرا ہوتا گیا اس کی سانس رکتی گئی۔ سکون جاتا رہا۔ جنگل میں جانے کا وقت آ پہنچا تھا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اپنے دل کی آوازیں صاف سنتے ہوئے وہ کھڑے ہوئے، اِدھر اُدھر دیکھا اور آہستہ سے چارپائی کے نیچے چھپ کر لیٹ گئے۔ ''سنو بیگم...'' انھوں نے وہیں سے کہا، اگر پنچوں کا بلاوا آئے تو کہہ دینا کہ ہم گھر پر نہیں ہیں۔''

''لیکن آپ تو گھر ہی میں ہیں۔''

''اور شیر سنگھ بلانے آئیں تو کہہ دینا کہ ہم بن سنور کر جنگل کی طرف چل دیے ہیں۔''

تب تک شیر سنگھ آ چکا تھا اور دہلیز پر سے باتیں سن رہا تھا۔ بولا ''نواب صاحب! آپ تو چارپائی کے نیچے گھسے ہوئے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ...''

نواب رنگیلے کے جوڑ جوڑ ہل اٹھے۔ پھر بھی اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے باہر نکلے اور کہا، ''اماں، ہم تو اپنی تلوار تلاش کر رہے تھے۔ تلوار کے بغیر بھلا ہم دشمن سے مقابلہ کرنے کیسے جا سکتے ہیں!''

''مل گئی؟'' شیر سنگھ نے من ہی من مسکراتے ہوئے پوچھ لیا۔

''بالکل!'' کہتے ہوئے انھوں نے میان میں سے تلوار نکالی اور ہوا میں دو چار حملے کرتے ہوئے سینہ تان لیا، ''انعام کے دس ہزار ساتھ لائے ہو نا؟''

''وہ تو پنچوں کے پاس محفوظ ہیں۔''

''ٹھیک ہے،'' تلوار میان میں رکھتے ہوئے وہ بولے، ''کل ہماری جیب میں ہوں گے۔ اب تم جاؤ شیرا، گھر جا کر چین کی نیند سو جاؤ۔ بس، ہم گئے ہی سمجھو۔''

شیر سنگھ بھی نواب رنگیلے کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے کہا، ''ایسی حماقت بھلا میں کیسے کر سکتا ہوں۔ میں تو کیا، پنچ بھی آپ کے ساتھ چلیں گے آپ کو جنگل کے راستے پر چھوڑ کر ہی دم لیں گے۔''

نواب رنگیلے کے پیروں تلے سے صرف زمین ہی نہیں نکلی، ساری دنیا ہی کھسک گئی۔
اب بچنا مشکل تھا۔ 'جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو' من ہی من بڑبڑاتے ہوئے وہ تیار ہونے لگے۔ کمر پر تلوار باندھی۔ سر پر ٹوپی رکھی۔ پاؤں میں جوتیاں ڈالیں اور شیر سنگھ سے بولے، "چلو۔" دونوں ساتھ ساتھ چل پڑے۔ چوراہا آتے ہی پنچ ساتھ ہو لیے۔
سینہ تانے ہوئے نواب رنگیلے دولہے کی طرح آگے آگے چل رہے تھے۔ کچھ پلوں کے لیے وہ بھول گئے تھے کہ وہ بھوت ناتھ ڈاکو سے لوہا لینے جا رہے ہیں۔
پیچھے پیچھے شیر سنگھ اور پنچ باراتی کی طرح قدم بڑھا رہے تھے۔
جیسے ہی گاؤں ختم ہوا اور جنگل دکھائی دیا، باراتی رک گئے۔ نواب رنگیلے نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ آگے دیکھا۔ پسینہ چھوٹ گیا۔ سامنے بیابان جنگل تھا۔ پیچھے ہٹنے کا اب سوال ہی نہیں تھا۔ بسم اللہ کہہ کر قدم اٹھایا اور وہ آگے بڑھ گئے۔
جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے، اندھیرا اور گہرا ہوتا گیا۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ نواب رنگیلے کے پیر کانپنے لگے۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ دھیرے دھیرے سارا بدن کانپ اٹھا۔ اب آگے بڑھنے کی نہ ان میں ہمت تھی، نہ طاقت تھی۔ وہ ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ سوچا، اسی پیڑ پر چڑھ کر ساری رات بتائی جائے۔ درخت پر چڑھنے سے خطرہ کم ہو جائے گا اور رات آنکھیں جھپکتے ہی ختم ہو جائے گی۔ صبح ہونے پر ہم نیچے اتر کر گھر پہنچ جائیں گے۔
بس، پھر بات کیا تھی۔ وہ فوراً درخت پر چڑھ گئے۔ لیکن انھیں کیا پتہ تھا کہ اسی درخت کی ایک موٹی شاخ پر ڈاکو بھوت ناتھ سو رہا ہے۔ جیسے ہی وہ اوپر آئے، بھوت ناتھ چونک کر جاگ اٹھا، پھر دہاڑا "کون ہے؟"
"ہم... م... میں۔"
"بکری ہے کیا؟"
'بکری' لفظ نواب صاحب کو چبھ گیا۔ وہ فوراً بولے، "ہم کوئی بھیڑ بکری نہیں، نواب جنگ بہادر

رنگیلے ہیں۔''

بھوت ناتھ پل بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔

''یہاں کیوں آئے ہو؟''

''بھوت ناتھ کو گرفتار کرنے۔'' اب تک وہ کافی صحت مند ہو چکے تھے، ''اس کمبخت نے سارے گاؤں کو پریشان کر رکھا ہے۔ آج تو ہم اسے یہاں سے کان پکڑ کر لے جائے بنا نہیں رہیں گے... ہاں، لیکن تم کون ہو؟''

''میں؟'' بھوت ناتھ کو ان کی باتوں میں کافی مزا آ رہا تھا۔ بولا، ''میں تو للّو حلوائی ہوں۔''

''یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''آج کل کاروبار ذرا کم ہو رہا ہے۔ سوچا، بھوت ناتھ کو گرفتار کر انعام ہی کما لوں۔''

''اوہ!'' نواب رنگیلے نے کہا، ''تو تم بھی دس ہزار کے چکّر میں یہاں آئے ہو۔ لیکن ہم کہے دیتے ہیں... ڈاکو بھوت ناتھ تمھارے بس کا روگ نہیں۔ اس کی موت ہماری تلوار پر صاف صاف لکھی ہے۔''

''ٹھیک ہے،'' بھوت ناتھ نے ہنسی کو روکتے ہوئے ڈوبی آواز میں کہا، ''ہائے رے، قسمت۔ مجھ بدقسمت کے نصیب میں ڈاکو کی موت بھی نہیں۔ اب میں یہاں رک کر کیا کروں گا... میں تو چلا۔''

''ارے، ارے!'' نواب رنگیلے نے اسے روکا، یہ سوچ کر کہ اس گھنے جنگل میں ایک سہارا ہے، یہ بھی چلا گیا، تو اس کا کیا ہوگا، ''بھائی للّو ہم تمھارے پیٹ پر لات مارنا قطعی نہیں چاہیں گے۔ اگر بھوت ناتھ کی گردن ہمارے پنجے میں پھنسی تو انعام کے روپے ہم تمھیں ہی انعام میں دے دیں گے۔ پیسا تو ہاتھوں کا میل ہے۔ اور ویسے بھی پیسوں کی ہمیں ضرورت نہیں۔ بیگم کے گہنے ابھی سلامت ہیں۔''

بھوت ناتھ نے فوراً سوچ لیا - کیوں نہ آج بیگم کے گہنے ہی اڑا لیے جائیں؟ ''نواب صاحب!'' اس نے کہا، ''میرے خیال سے بھوت ناتھ آج اپنا چہرہ دکھانے کی جرأت نہیں کرے گا۔''

''کیوں؟ کیوں؟''

''آج آپ خود جو تشریف لائے ہیں۔''

''تو؟''

''میری مانیں تو... بے کار میں یہاں رات کاٹنے کے بجائے گھر لوٹ کر چین کی نیند سویا جائے۔''

نواب رنگیلے کو یہ رائے پسند آئی۔''پتے کی بات کہی، تم نے بھائی للّو... چلو!''

درخت سے دونوں نیچے اتر آئے۔ آگے آگے نواب رنگیلے اور پیچھے پیچھے بھوت ناتھ چلا۔

''کس گاؤں کے حلوائی ہو تم؟''

''ڈھول پور کا ہوں، نواب صاحب۔'' بھوت ناتھ بولا،''برے دن کیا بیٹھے، قسمت ہی پانی میں بیٹھ گئی... دو دن سے کچھ بھی نہیں کھایا۔''

نواب رنگیلے کو اس پر ترس آ گیا۔ بولے،''بھائی للّو، ایسے ہمت نہ ہارو، اللہ پر بھروسہ رکھو۔ ہر رات کے آنچل میں ایک صبح چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ ایسا کرو، میرے ساتھ گھر چلو۔''

''نہیں، نہیں۔''

''اماں، اس میں تکلّف کی کیا بات ہے۔ دانے دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے،'' وہ کہتے جا رہے تھے،''ہمارے گھر تم دو روٹی کھاؤ گے تو ہمارا اللہ بھی خوش ہو جائے گا۔''

رات کے قریب ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ نواب رنگیلے کی فکر میں بیگم جاگتی لیٹی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ بیگم اچھل پڑی،''کون؟''

نواب رنگیلے نے آہستہ سے کہا،''ہم۔''

بیگم نے فوراً دروازہ کھولا اور نواب رنگیلے کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر آنچل کھینچ لیا۔

''شرماؤ نہیں بیگم۔'' نواب رنگیلے نے اپنے نئے دوست کا تعارف کراتے ہوئے کہا،''بیگم دو دن کا بھوکا پیاسا ہمارے گھر آیا ہے، جلدی سے حلوا پوری بنا دو۔''

بیگم رسوئی میں چلی گئی۔

''سنتے ہو!'' چولہا جلاتے ہوئے اس نے وہیں سے کہا،''آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ بھوت ناتھ

ڈاکو کا کیا ہوا؟''

''اب ہوگا کیا؟'' نواب رنگیلے کی آواز میں فتح کی کھنک تھی، ''اس گیدڑ کو پتہ چلا کہ ہم اس کی تلاش میں ہیں، وہ بھیگی بلّی بن گیا۔ صورت ہی نہیں دکھائی۔''

''سچ؟''

''گواہ حاضر ہے۔ پوچھ لو بھائی للّو سے۔''

بھوت ناتھ ڈاکو، جو للّو حلوائی بن کر نواب رنگیلے کے ساتھ گھر میں گھس آیا تھا، اس نے ہاں میں ہاں ملا دی۔ پھر جوڑا، ''آخر ہمارے نواب صاحب بھی سینہ رکھتے ہیں، وہ بھی لوہے کا۔ بھوت ناتھ جیسے مچھر بھلا اس سے کیا ٹکرائیں گے۔''

نواب رنگیلے کا سینہ تھوڑا اور چوڑا ہو گیا، پر بیگم رنگیلی اتنی بھولی نہ تھی۔ اجنبی کا چہرہ دیکھتے ہی اسے کھٹکا ہوا تھا۔ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ نواب رنگیلے کہتے ہیں کہ وہ للّو حلوائی ہے، لیکن حلوائی کے چہرے ایسے سخت، پتھر سے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔

تب یہ پٹّھا کون ہو سکتا ہے؟ حلوا پوری تیار ہونے تک بیگم رنگیلی کا شک یقین میں بدل گیا۔ اور اس کی بھی وجہ تھی۔ وہ جانتی تھی ڈھول پور میں تو حلوائی ہے ہی نہیں۔ ویسے پڑوس والے گاؤں ڈھول پور کی بستی ہی کتنی ہے؟ وہاں کے لوگ تو میٹھا خریدنے یہاں، نگاڑا پور آتے ہیں۔

بیگم نے بھانپ لیا کہ نواب جسے للّو حلوائی سمجھ رہے ہیں کوئی اور نہیں، بلکہ ڈاکو بھوت ناتھ ہے۔ ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟ اس وقت شور مچانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کہیں بھوت ناتھ پستول نکال کر شوہر میاں کو گولی مار دے تو؟

''ارے بیگم!'' بیٹھک سے نواب رنگیلے نے آواز دی، اب اور کتنا انتظار کرواؤ گی؟ اب تو ہمارے پیٹ میں فائرنگ ہونے والی ہے۔''

بیگم کو ترکیب سوجھی۔ بندوق کی گولی نہ سہی، نیند کی گولی اس وقت کام آ سکتی ہے۔ فوراً اس نے نیند کی گولیوں کی بوتل لی اور ساری گولیوں کا آٹا بنا کر حلوے کی ایک پلیٹ میں ملا دیا۔

اپنی چالاکی پر من ہی من مسکراتی ہوئی بیگم رنگیلی حلوا پوری کی دو پلیٹوں کے ساتھ جیسے ہی بیٹھک میں داخل ہوئی کہ نواب صاحب نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں سے دونوں پلیٹیں جھپٹ لیں۔

بیگم کچھ کہے یا اشارہ کرے، اس سے پہلے وہ بھوت ناتھ کے سامنے آئے اور کہا، ''ہماری بیگم کے ہاتھوں بنا حلوہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ہمارے وزیراعظم جب نگاڑا پور آتے ہیں، تو یہیں، اسی چارپائی پر بیٹھ کر کھاتے ہیں اور ایک ڈبّہ بھر کر اپنے ساتھ دلّی بھی لے جاتے ہیں۔ بھائی للّو ہو جاؤ شروع۔''

بیگم نے سر پیٹ لیا۔ جو پلیٹ بھوت ناتھ کو دینی تھی، نواب رنگیلے نے خود رکھ لی اور جو اپنے پاس رکھنی تھی، وہی بھوت ناتھ ڈاکو کو دے دی۔ ہائے اللہ، یہ تو غضب ہو جائے گا۔

''سنتے ہو...!''

لیکن سنا کس نے؟ بھوت ناتھ کے ساتھ نواب رنگیلے بھی حلوہ پوری کا مزہ لینے میں ایسے مشغول تھے کہ آسمان ٹوٹنے پر بھی ان پر کوئی اثر ہونے والا نہیں تھا۔

''واہ!'' آدھی پلیٹ صاف ہو جانے پر نواب رنگیلے کے ہونٹ کھلے، ''سبحان اللہ! کیا چیز بنائی ہے۔ جی چاہتا ہے حلوے پوری کے ساتھ پلیٹ بھی کھالی جائے! بھائی للّو!''

''جی...!''

''شاید تم یہ نہیں جانتے کہ ایشور یہ رائے ہماری بیگم سے کیوں جلتی ہے!''

''کیوں؟''

''آج تک وہ ایسا حلوہ بنا ہی نہیں سکی!'' یہ کہتے ہوئے وہ بارچی خانے کی طرف مڑے، ''ارے یہاں کیوں کھڑی ہو بیگم؟ ذرا تم بھی چکھ لو۔''

''ایں...۔'' اس کی سانس میں ہڈّی پھنس گئی۔

''جس محبت سے تم نے حلوہ بنایا ہے اتنی ہی محبت سے ہم تمھیں اپنے ہاتھوں کھلائیں گے۔''

''نہ۔ نہ۔ مجھے بھوک نہیں...۔''

''ہماری جان کی قسم، جو پھر 'نہ' کہا۔'' کہتے ہوئے وہ خود چل کر بیگم کے پاس آئے اور کھڑے

ہو گئے۔ بیگم لاکھ منع کرتی رہی لیکن اس کی ایک بھی نہیں چلی۔ نواب صاحب نے اپنی جان کی قسم جو دی تھی۔

''کیوں بھائی للّو۔'' چارپائی پر واپس آتے ہوئے نواب رنگیلے نے پہلے جمہائی لی، ''سچ سچ بتانا، کبھی تم نے ایسا لذیذ حلوہ بنایا ہے؟''

''میں نے تو کیا، ہمارے خاندان میں کسی نے نہیں بنایا۔''

''سن لیا بیگم۔'' چارپائی پر دراز ہوتے ہوئے انھوں نے کہا، ''بھائی للّو حلوائی کا سرٹیفکیٹ بھی تمھیں مل گیا...۔''

وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن آگے کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ ان کی آنکھیں لگ گئیں۔ ناک بجنے لگی۔

ادھر کچن میں بیگم کا سر چکرانے لگا۔ اپنی چالاکی پر وہ اب خود ہی شرمندہ ہو رہی تھی۔ اپنے آپ پر لعنتیں برسا رہی تھی۔ لیکن اب کیا، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ کچھ ہی منٹوں میں وہ بھی ڈھیر ہو گئی۔

بھوت ناتھ ڈاکو حیرت سے دیکھتا رہا۔ معجزہ۔ اس نے سوچا، سچ مچ معجزہ۔ اور وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اطمینان سے اس نے الماری کھولی اور بیگم کے گہنوں کا ڈبّہ ڈھونڈ کر ٹھاٹھ سے چلتا بنا۔

بھوت کے بھائی

ہند، پاک بٹوارے سے پہلے نگاڑاپور کے لوگ مرغے کی میٹھی بانگ سے جاگ جایا کرتے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد مرغوں کا کام مل کے سائرن نے سنبھال لیا۔ سائرن کی گونج میں، نہ مرغوں کی آواز کی مٹھاس تھی، نہ کوے کی کائیں کائیں کی کڑواہٹ۔ پھر بھی لوگوں نے بدلتے وقت کے ساتھ اس نئی آواز کو اپنالیا۔ شیر سنگھ بھی اس سے الگ نہیں تھا۔

سائرن کی گونج کان پر رینگتے ہی وہ اٹھ بیٹھا۔ دونوں کانوں میں انگلی گھسا کر دو تین بار گھمائی۔ مانو کوئی مچھر گھس گیا ہو۔ پھر ایک لمبی جمہائی لی، تو اسے یاد آیا کہ رات میں اس نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اس نے نواب رنگیلے کو بھوت ناتھ ڈاکو سے ٹکراتے دیکھا تھا۔

دونوں کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں اور جانی دشمن کی طرح دونوں ایک دوسرے پر حملہ کر رہے تھے۔ پھر کیا ہوا؟ نواب صاحب نے ڈاکو کا سر قلم کر دیا۔ ڈاکو بھوت ناتھ نے نواب صاحب کو بقرعید کے بکرے کی طرح حلال کر دیا؟ وہ نہیں جانتا تھا اس عظیم جنگ کا اختتام ہو، اس سے پہلے ہی مل کا سائرن گونج اٹھا تھا۔

شیر سنگھ ہاتھ منہ دھو کر سیدھا نواب رنگیلے کے گھر جا پہنچا، ''اماں، نواب صاحب۔'' اس نے بند دروازے پر آواز دی، ''مل کا سائرن کب کا بج چکا، اب تو جاگو۔'' پھر اسے یہ بھی یاد آیا کہ نواب رنگیلے رات میں دیر سے لوٹے ہوں گے، اتنی جلدی کیسے جاگیں گے۔ ایک رات کی بیداری کے بدلے وہ سات دن اور سات راتوں پڑے رہیں تو حیرانی نہیں۔ لیکن بیگم رنگیلی کو بھی کیا سانپ سونگھ گیا ہے؟ تبھی ہوا کا جھونکا آیا اور دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔ شیر سنگھ کو تعجب ہوا۔ تعجب اس لیے کہ رات کے کھانے کے بعد

نواب رنگیلے دروازہ بند کر اندر سے تالا لگاتے تھے۔

شیر سنگھ آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر دروازے کے قریب آیا اور جھانک کر اندر دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گیا۔ چارپائی پر رنگیلے ایسے لیٹے تھے مانو کٹورا بھر کر زہر پی لیا ہو۔ ان کی ایک ٹانگ چارپائی پر تھی تو دوسری چارپائی کے نیچے جھول رہی تھی۔ دونوں ہاتھ سکندر کی لاش کی طرح کھلے تھے۔

شیر سنگھ نے اپنی چوڑی آنکھیں گھمائیں۔ کچن کے فرش پر کچھ ویسی ہی حالت میں پڑی ہوئی بیگم رنگیلی بھی نظر آئی۔ شیر سنگھ کو یہ سوچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہ کام صرف ڈاکو بھوت ناتھ کا ہوسکتا ہے۔ کسی طرح اس نے سیندھ لگائی ہوگی۔ پھر دونوں کو زہر پلا کر بیگم رنگیلی کے گہنوں کے ساتھ غائب ہوگیا ہو تو تعجب نہیں۔ ویسے کھلی الماری بھی صاف نظر آرہی تھی۔

''ہے رام!'' شیر سنگھ نے اپنے بھگوان کو یاد کیا اور تھانے دار کو آگاہ کرنے دوڑ پڑا۔

''کیا بات ہے، شیرا؟'' تھانے دار بندوقی لال نے اپنی مونچھیں موڑتے ہوئے پوچھا، ''صبح صبح کہیں پاگل کتّے نے تو کاٹ نہیں کھایا۔ شیر سنگھ اتنی تیزی سے دوڑتا ہوا آیا تھا کہ اس کے لیے کچھ منٹوں میں کچھ کہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ صرف ہانپتا رہا، گہری سانسیں لیتا رہا۔ پھر کہا، ''غضب ہوگیا۔''

''کسی کے بیل نے سینگ مارا؟'' تھانے دار بندوقی لال اب بھی مذاق کے موڈ میں تھے۔

''بھوت ناتھ!''

''اس کا کیا؟''

''رات میں نواب صاحب نے اسے چیلنج دیا تھا، شیر سنگھ نے بتانا شروع کیا، ''ابھی جا کر دیکھا تو نواب صاحب اور بیگم دونوں...''

''بھوت ناتھ دونوں کو اٹھا لے گیا؟''

''نہیں۔ دونوں کا خاتمہ کر، ان کی الماری صاف کی اور غائب ہوگیا!''

''کیا کہتے ہو!''

تھانے دار کرسی پر سے اچھل پڑے، ''رات میں کچھ خواب تو نہیں دیکھا؟''

''آپ خود ہی چل کر دیکھ لیں۔'' شیر سنگھ بولا ''دونوں کی لاشیں ان کے گھر میں پڑی ہیں۔''

تھانے دار بندوقی لال نے ٹوپی سر پر رکھتے ہوئے، پستول کمر کے پٹے میں ٹھونسی اور شیر سنگھ کے ساتھ چل دیے۔ صبح کے سات بج چکے تھے۔ غرارہ کرنے کی گلا پھاڑ آوازیں گھر گھر سے اٹھ رہی تھیں۔ کچھ لوگ گھر کے چبوترے پر بیٹھ کر مسواک کر رہے تھے۔ طیب علی بوری بھی انھیں میں سے ایک تھا۔

''کیا بات ہے، تھانے دار صاحب؟'' گلا صاف کر وہ بندوقی لال سے بولا، ''رات میں کہیں ڈاکہ واکہ پڑا ہے کیا؟''

تھانے دار بندوقی لال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ شیر سنگھ نے اس کے پیچھے تیز قدم بڑھاتے ہوئے بتادیا، ''نواب اور بیگم رنگیلی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔''

اڑوس پڑوس کے سارے لوگ جھینپ گئے۔ لیکن طیب علی بوری پر اس بات کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ ''خواب میں شیر مارنا اور بات ہوتی ہے۔ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ اس راز کا پتہ نواب صاحب کو چل ہی گیا ہوگا۔ لیکن اب کیا فائدہ؟''

تھانے دار بندوقی لال نے نواب رنگیلے کے مکان کے دروازے سے بالکل ویسے ہی جھانکا جیسے پہلے شیر سنگھ جھانک چکا تھا۔ پھر وہ اندر داخل ہوئے۔ شیر سنگھ ان کے پیچھے ہی تھا۔ پوچھا، ''کیا لگتا ہے، سر؟''

''معاملہ بالکلہ صاف ہے،'' انھوں نے غور سے سبھی چیزیں دیکھتے ہوئے اپنی رائے دی، ''میں نے تو کئی بار نواب صاحب کو سمجھایا تھا کہ پولس والوں کے کام میں دخل دینا ٹھیک نہیں۔ لیکن وہ مانے تب نا؟ لو، اب نتیجہ سامنے آ گیا۔ ڈاکو بھوت ناتھ دونوں کا آملیٹ بنا کر چلتا بنا۔ اب بھلا میں کیا کرسکتا ہوں... سوائے اس کے کہ جنازے کو کندھا دوں۔''

شیر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر بھی اس نے کہا، ''کیا، نواب صاحب کے قاتل کو گرفتار کرنا آپ کا فرض نہیں ہے؟''

''تو اب یاد آیا تمھیں ہمارا فرض؟'' تھانے دار بندوقی لال نے کتراتے ہوئے بتادیا، ''جاؤ، کہو اپنے نواب صاحب کے مردے سے کہ بھوت ناتھ کو گرفتار کریں۔ آپ لوگوں کے ہمدرد تو وہی تھے، ہمیں کیا مطلب؟''

''لیکن...''

''ٹھیک ہے، ٹھیک!'' دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ بولے، ''ہم سوچیں گے۔ اس وقت ہمارا دماغ آنے والے چناؤ کی تیاری میں لگا ہے۔''

اب تک نواب صاحب کے مکان کے باہر کافی بھیڑ اکٹھا ہوچکی تھی۔ سبھی یہ جاننے کو بے چین تھے

کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ کیا سچ مچ نواب رنگیلے اور بیگم رنگیلی سدھار گئے یا اب بھی کوئی امید باقی ہے؟

بھیڑ کو دیکھ کر تھانے دار بندوقی لال کو پھر ایک بار چناؤ یاد آ گیا۔ چناؤ کے دوران تقریر کرنا ان کا شوق تھا۔ ویسے بھی موقع ملنے پر وہ دو لفظ کہہ دیتے تھے، ''آپ سبھی کو یہ بتاتے ہوئے کلیجہ پھٹا جا رہا ہے، لیکن ہم مجبور ہیں۔'' بڑی بڑی مونچھوں کو پھیلاتے ہوئے وہ شروع ہوئے، ''آپ لوگوں کو یہ تکلیف دہ خبر سنانا شاید ہماری ہی قسمت میں لکھا ہے۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ نواب رنگیلے ہمارے گاؤں نگاڑاپور کے بہادر مرد تھے اور ایسے مرد کسی سے نہیں ڈرتے، ڈاکو بھوت ناتھ سے بھی نہیں! نواب صاحب نے ہمارے گاؤں کی حفاظت کے لیے تلوار اٹھائی اور... اور بیگم رنگیلی کے ساتھ شہید ہو گئے!''

یہ سننا تھا کہ لوگ تڑپ اٹھے۔ کیا ہندو، کیا مسلمان، سبھی کے دل پسیج گئے۔ نواب رنگیلا آزادی کے بعد بھلے ہی ان لوگوں کے سرپرست نہ ہوں، عوام کے چہیتے تو تھے۔ ان کی بھولی بھالی بے گناہ باتیں سن کر بچے تو کیا بوڑھے بھی رس گلّے بن جاتے تھے۔ ان کے چند قصے لوگوں کو زبانی یاد تھے۔ ان قصّوں کو دہرا کر لوگ آپس میں ہنس لیا کرتے تھے۔

لیکن آج ہنسی کا موقع نہیں تھا۔ ہنسی کی گنجائش نہیں تھی۔ دو جنازے ایک ساتھ اٹھے تھے۔ ایک تھا نواب رنگیلے کا، دوسرا تھا بیگم رنگیلی کا۔ سارا گاؤں جنازے میں شامل تھا۔ تھانے دار بندوقی لال تھے اور طیب علی بوری بھی تھا۔ پنڈت ماکھن لال تھے اور مولوی علی ولی بھی تھا۔ دونوں جنازے جھومتے ہوئے گلی محلّوں سے گزر رہے تھے۔ کوئی ان پر پھول برساتا تھا تو کوئی پھولوں کی چادر بچھاتا تھا۔ کوئی ان پر گلاب جل چھڑکتا تھا تو کوئی گنگا جل۔ قومی ایکتا کا ایسا بے مثال نظارہ شاید ہی سارے ہندوستان میں کسی نے دیکھا ہو۔

کلّو کلہاڑی نے دو قبریں کھود کر پہلے سے ہی تیار رکھی تھیں۔ قبروں کے لیے جگہ بھی عمدہ چنی گئی تھی۔ ان پر گل مہر کا درخت تھا۔ ہوا کے جھونکے کے ساتھ لال لال پھولوں کی پنکھڑیاں اڑ کر چاروں طرف بکھر رہی تھیں۔ شیر سنگھ نم آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ نگاڑاپور میں اس کا کوئی جگری دوست تھا، تو وہ صرف نواب رنگیلے تھے۔ نواب صاحب کی موت کا سب سے زیادہ صدمہ اسے ہی پہنچا تھا۔

جب جنازوں سے لاشیں نکالی گئیں اور قبر میں اتارنے کی تیاریاں شروع ہوئیں، تو اچانک پنڈت ماکھن لال نے منہ کھولا، ''ٹھہرو!''

سبھی چونک گئے۔

سبھی ٹکٹکی باندھ ان کی طرف دیکھنے لگے۔ ایکا ایک پنڈت جی کو کیا تکلیف ہوئی کہ لاشیں دفن ہونے سے پہلے وہ چلا اٹھے، ''مجھے اپنے مسلمان برادروں سے ایک سوال کرنا ہے۔''

اب کے مسلمانوں کے ساتھ ہندو برادر بھی چوکس ہو گئے۔ پنڈت جی کوئی نیا مسئلہ چھیڑنے جا رہے ہیں، یہ بات سبھی نے بھانپ لی۔ لیکن بات کیا تھی یہ کوئی سوچ نہیں پایا۔ آخر طیب علی بوری تلملا کر بول اٹھا، ''ٹیرا سوال کیا ہے وہ بتا دے نا! خواہ مخواہ سسپینس کائی کو مارتا ہے؟''

''بات مذاق کی نہیں، سوچنے کی ہے۔'' پنڈت جی نے ویسے ہی سنجیدگی بنائے رکھتے ہوئے بم پھینکا، ''نواب صاحب کو دفن کرنے سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ کیا نواب رنگیلے سچ مچ مسلمان تھے؟''

یہ سننا تھا کہ کچھ پلوں کے لیے سبھی کے چہرے چوڑے ہو گئے۔ طیب علی بوری نے مولوی علی ولی کی طرف دیکھا۔ مولوی صاحب نے پنڈت جی کو چیلنج دیتے ہوئے پوچھ ڈالا، ''قبلہ، آپ کو یہ شک کیسے ہوا کہ نواب رنگیلے مسلمان نہیں تھے؟''

''کیا آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمان تھے؟''

''اماں، نواب صاحب تو کیا، ان کا پورا خاندان مسلمان تھا۔'' مولوی علی ولی کو اب ثبوت پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، ''محرم کے تابوت وہ بناتے تھے۔ جمعہ کی نماز وہ میرے پیچھے کھڑے ہو کر پڑھتے تھے۔ ہفتہ بھر بھلے ہی وہ نہاتے نہ ہوں، جمعہ کو بیشک وہ نہالیا کرتے تھے۔ اور بھی ثبوت چاہیے، تو جان لو کہ چاہے ان کی حالت کیسی بھی پتلی رہی ہو، ان کی ایک ٹانگ ہمیشہ اونچی رہتی تھی۔''

پنچایت کے ممبروں نے مولوی صاحب کی ہاں میں ہاں ملائی۔ پھر پنڈت جی کی طرف مڑے۔ اب ثبوت پیش کرنے کی باری ان کی تھی۔ وہ بولے، ''یہ سچ ہے کہ نواب رنگیلے محرم کے تابوت بناتے تھے، تو یہ بھی سچ ہے کہ دسہرے کا راون انھیں کے ہاتھوں بنتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد جاتے تھے، تو یہ بھی سچ ہے کہ ہر سنیچر کو ہنومان جی کا پرشاد ان کے گھر جاتا تھا۔ اگر ان کی ایک ٹانگ اونچی ہونا ان کے مسلمان ہونے کی نشانی ہے تو ان کی دوسری ٹانگ نیچی ہونا ان کے ہندو ہونے کا ثبوت ہے۔ اور بھی سننا چاہو گے؟ تو جان لو کہ وہ جتنے پیارے مسلمانوں کو تھے، اس سے زیادہ وہ ہندوؤں کے چہیتے تھے۔''

پنچوں نے پنڈت کی دلیلوں پر بھی ہاں میں ہاں ملادی۔ معاملہ پیچیدہ ہو گیا۔ جب تک یہ فیصلہ نہ ہو کہ نواب رنگیلے سچ مچ کون تھے، کیا تھے، انھیں دفن کرنا ناممکن تھا۔ سارا گاؤں دو چھاؤنیوں میں بٹ گیا۔ دونوں طرف گرماہٹ نظر آرہی تھی۔

پنچ بھی سوچ میں پڑ گئے اگر وہ یہ کہہ دیں کہ نواب صاحب مسلمان تھے تو ہندو لوگ بھڑک اٹھیں اور فیصلہ دیں کہ ہندو تھے تو مسلمان لوگ تڑپ اٹھیں۔ دنگے، فساد کا پورا امکان تھا۔ اب کیا کریں؟ آخر پنچوں نے مشورہ کیا اور بال بال بچ نکلنے کا پینترا سوچ ہی نکالا۔ نگاڑا پور میں ننانوے سال کا ایک بوڑھا رہتا تھا۔ یہ پیچیدہ معاملہ اسی کے سامنے پیش کیا جائے اور وہ بزرگ جو بھی فیصلہ دے، دونوں چھاؤنیاں

اسے منظور رکھیں۔ پنڈت جی کو ان میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ مولوی صاحب کو بھی یہ بات سمجھ میں آ گئی۔

اسی وقت سبھی لوگ گاؤں کی طرف چل دیے۔ صرف قبر کھودنے والا کلّو کلہاڑی چلم پھونکتا ہوا وہاں بیٹھا رہا۔ چلم میں اس نے نواب صاحب کی موت کا غم دور کرنے کے لیے تھوڑی سی چرس بھی ملا رکھی تھی۔ وہ دم پر دم مارے جا رہا تھا کہ اس کی سانس رک گئی۔ اس نے غور سے دیکھا، نواب رنگیلے کی لاش سوئی نہیں، بلکہ بیٹھی ہے۔ کہیں یہ چرس کا نشہ تو نہیں؟

نہیں۔ سوال دوسرا۔ کیا مرنے کے بعد کوئی اتنی تیزی سے بھوت بنتا ہوگا۔ وہ کچھ آگے سوچے، اس سے پہلے نواب رنگیلے نے اس کے سامنے دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کا دماغ چکرا گیا، چلم ہاتھ میں سے سرک گئی۔ غش کھا کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

نواب رنگیلے نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سر کھجلایا۔ پھر بیگم کو جگاتے ہوئے کہا، ''دیکھو، ہماری کرامت! ہم اپنے گھر میں سوتے ہیں اور آسمان کے نیچے ہماری آنکھیں کھلتی ہیں!'' بیگم رنگیلی کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ ابھی بھی وہ بوکھلائی ہوئی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ نواب رنگیلے نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور گھر کی طرف چل دیے۔

اِس طرف سارا گاؤں ماتم کرتا ہوا قبرستان کی طرف لوٹ رہا تھا۔ فیصلہ ہو چکا تھا۔ ننانوے سال کے بزرگ نے بتایا، ''چونکہ نواب صاحب پیدائشی مسلمان تھے، ان کی آخری رسومات بھی مسلمان مذہب کے رسم و رواج کے مطابق ہونی چاہیے۔'' پنڈت ماکھن لال اور ان کی چھاؤنی کے لوگوں نے بڑا دل رکھ کر فیصلہ منظور کر لیا تھا۔

کچھ ہی پلوں میں نواب رنگیلے اور بیگم رنگیلی دفن ہو جانے والے تھے۔ اس خیال سے سبھی گاؤں والے پھر ایک بار غمگین ہو گئے تھے۔ آنسو بہانے لگے تھے۔ کمزور دل کے لوگ سر بھی پیٹ رہے تھے۔

نواب رنگیلے نے جلوس کو دور سے آتے دیکھا، ''لگتا ہے...'' بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا، ''ڈاکو بھوت ناتھ نے سارے گاؤں والوں کا بنٹا دھار کر ڈالا ہے۔ کسی کو نہیں چھوڑا۔ دیکھو، دیکھو۔

گاؤں والے کیسے بلک بلک کر رو رہے ہیں۔!''

بیگم رنگیلی کو پچھلی رات کی واردات یاد آ گئی۔اس نے سوچا بھوت ناتھ نے ان کے اپنے گہنے بھی نہیں چھوڑے ہوں گے۔ یہ خیال آتے ہی وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔نواب رنگیلے حیران رہ گئے۔ ''میرے گہنے، میرے گہنے!'' چلاتی ہوئی وہ گھر کی طرف دوڑی۔نواب رنگیلے کے لیے پیسہ ہاتھوں کا میل تھا،اس لیے گاؤں والوں کو تسلّی دینے وہ جلوس کے پیچھے دوڑ گئے۔

سب سے آخر میں مولوی علی ولی ویسے ہی ماتم کرتے ہوئے آ رہے تھے جیسے شیعہ لوگ محرّم میں امام حسینؓ کا ماتم کرتے ہیں۔نواب رنگیلے نے ان کے پیچھے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے انھیں دلاسا دینے کی کوشش کی، ''دیکھو میاں، اب رونے سے کیا فائدہ؟ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔قسمت کا لکھا بھلا کوئی مٹا تھوڑے ہی سکتا ہے۔''

''روؤ، روؤ!'' مولوی صاحب آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہے جا رہے تھے، ''زمیں روؤ، آسمان روؤ، چاند روؤ، سورج روؤ، پرندے روؤ، چرندے روؤ، چینٹی روؤ، چمگادڑ روؤ! بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔''

نواب صاحب کو لگا، جلوس کو سمجھانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔آسمان پھٹا تھا۔وہ اکیلے بھلا کیا کر سکتے تھے۔بیگم کے پیچھے وہ بھی اپنے گھر کی طرف چل دیے۔

گاؤں والے قبرستان پہنچے تو ایک عجوبہ دیکھا۔کلّو کلہاڑی بے ہوش پڑا ہے اور دونوں لاشیں غائب۔سبھی کے آنسو تھم گئے۔آنکھیں پھیل گئیں۔منہ کھل گئے۔

مولوی علی ولی نے پنڈت کی طرف شک کی نظروں سے دیکھا۔کہیں ہندوؤں کی یہ سازش تو نہیں؟ پنڈت جی کی چھاؤنی والوں نے دونوں لاشیں غائب تو نہیں کروا دیں؟ تبھی کلّو کلہاڑی کو ہوش آیا اور اس نے آنکھیں کھولیں۔آنکھیں کیا کھلیں، ایک ساتھ کئی بھوت ناچ اٹھے۔مانو ان کا دماغ بھوتوں کا اڈّا ہو! ''بھوت! بھوت!'' وہ چلاّ اٹھا۔کوئی کچھ پوچھے اس سے پہلے ہی وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا گاؤں کی طرف دوڑ گیا۔

پھر ایک بار سبھی لوگ حیرانی میں پڑ گئے۔ آخر ہوا کیا؟ دونوں لاشیں گئیں کہاں؟ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پنڈت جی نے پنچوں کی طرف دیکھا۔ اب تک پنچوں نے سوچ لیا تھا، ضرور کوئی خوں خوار جانور جنگل کی طرف سے آیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے لکڑ بگھوں کا جھنڈ ہی آیا ہو اور دونوں لاشوں کو اٹھا کر چلتا بنا ہو۔ ایسا دردناک منظر دیکھ کر کلّو کلہاڑی بے ہوش ہو جائے یہ بھی ممکن تھا۔

گاؤں کی طرف آگے بڑھتے ہوئے طیب علی بوری نے پوچھا، ''تب وہ بھوت بھوت کا ٹیکو چلایا؟'' سوال پتے کا تھا۔ اس کا صحیح صحیح جواب جاننے کے لیے کلّو کلہاڑی کو گردن سے پکڑ کر دو چانٹے مارنا ضروری تھا۔ اس چرسی سے باتیں اگلوانے کے لیے آج تک کسی کو تیسرا چانٹا رسید کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

اگر وہ کسی بھوت پریت کی چپیٹ میں سچ مچ آ گیا ہو تو میں اس کا علاج بھی جانتا ہوں!'' مولوی علی ولی نے اپنی گردن شتر مرغ کی طرح اونچی کرتے ہوئے بتایا، ''بڑے بڑے جنّ میں نے بوتل میں اتارے ہیں۔''

تبھی پاگلوں کی طرح سامنے سے آتا ہوا کلّو کلہاڑی نظر آیا۔ وہ ابھی بھی چلا رہا تھا، ''بھوت! بھوت!'' مولوی صاحب نے ہمت سے آگے بڑھ کر اسے گردن سے پکڑا، ''ابے کس کا بھوت؟'' دو چانٹے رسید کرتے ہوئے انھوں نے پھر پوچھا، ''کہاں ہے بھوت؟''

کلّو کلہاڑی نے نواب رنگیلے کے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ سبھی کی نظر اس جانب گئی۔ اندر کچھ آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ مولوی صاحب دبے پاؤں نواب رنگیلے کے مکان کی طرف آگے بڑھے۔ پیچھے پیچھے اتنی ہی ہوشیاری برتتے ہوئے گاؤں والے قدم بڑھا رہے تھے۔

وہ لوگ مکان کے قریب پہنچے۔ اس سے پہلے نواب رنگیلے نے کھڑکی میں آ کر دیدار کرائے۔ مولوی علی ولی کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ گاؤں والوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں! ''بھوت! پلیت! بھاگو۔'' مولوی صاحب چلائے۔ لوگ باگ ایسے بھاگے مانو آسمان سے ایٹم بم گرنے والا ہو! دیکھتے ہی دیکھتے سارے گاؤں میں سنّاٹا چھا گیا۔ سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے تھے۔

دروازے بند کر لیے تھے۔ مولوی صاحب نے تو اپنے گھر کا دروازہ بند کر اندر سے تین تالے مارے تھے۔
نواب رنگیلے ابھی بھی کھڑکی میں کھڑے کھڑے سوچ رہے تھے۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ پنڈت جی اور مولوی صاحب کے گھر اغل بغل میں تھے۔
''میاں، سنتے ہو؟'' پنڈت نے اپنے گھر کی کھڑکی تھوڑی سی کھول کر آواز دی۔
''بہرا نہیں ہوں۔'' مولوی صاحب نے بھی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے بتا دیا، ''جو کچھ کہنا ہو فٹافٹ کہہ دو۔ یہ مت سوچو کہ بھوت کھڑکی سے بھی تمھارے گھر میں گھس سکتا ہے۔''
''ایں...!'' پنڈت جی بولے، ''ہماری کھڑکی سے کیوں؟ ہمارے گھر میں کیوں؟ آپ کے گھر میں کیوں نہیں؟''
''اماں تمھیں نے تو زوردار بحث کرتے ہوئے کہا تھا کہ نواب رنگیلے مسلمان نہیں۔ اگر وہ مسلمان نہیں تو ان کا بھوت بھی مسلمان نہیں ہو سکتا۔''
''تو؟''
''تو کیا؟'' مولوی صاحب نے کترا کر کہا، ''نواب رنگیلے کو تم لوگ زیادہ پیارے تھے ان کا بھوت تمھارے ہی گھر میں گھسے گا، نہ کہ ہمارے۔''
''ناممکن۔'' پنڈت چلا اٹھے، آخر تو نواب رنگیلے مسلمان تھے اور آپ سبھی مسلمانوں کو ان پر فخر تھا۔ مطلب، نواب صاحب کا بھوت کوئی مسلمان گھر ہی چنے گا۔''
یہاں ادھ کھلی کھڑکیوں سے بحث چل رہی تھی کہ نواب رنگیلے آ پہنچے۔ دونوں کھڑکیاں دنادن بند ہو گئیں۔ نواب صاحب پریشانی سے دیکھتے رہے۔ آخر ان گنواروں کو ہو کیا گیا ہے؟ اچانک ہماری صورت سے نفرت کیوں؟
انھوں نے پنڈت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔
پنڈت اندر ہی اندر کانپ اٹھے۔ بولے، ''میرے پیارے نواب رنگیلے کے بھوت! شاید تم گھر بھول گئے ہو۔ مولوی صاحب کا گھر پڑوس میں ہے۔''

اب نواب رنگیلے کی سمجھ میں کچھ کچھ آیا۔ لوگ باگ انھیں بھوت سمجھ رہے ہیں۔ کمال! ''اماں، پنڈت جی!'' وہ چلائے، ''ہم بھوت نہیں ہیں!''

''تب کیا پلیت ہو؟''

''نہیں۔''

''تب ضرور خبیث یا جنّ ہوں گے۔''

''اماں، ہم تو وہی ہیں جو پہلے تھے۔''

پنڈت جی کو تھوڑا بھروسہ ہوا۔ پھر بھی انھوں نے آدھا دروازہ کھولا، ''سچ؟''

''واللہ چھوکر دیکھ لو!''

ڈرتے ڈرتے پنڈت جی باہر آئے اور نواب صاحب کو چھوکر دیکھا۔ بھوت پریت لامحسوس ہوا کرتے ہیں۔ لیکن یہ میاں تو بالکل ٹھوس ہیں۔ اب انھیں پورا یقین ہوا۔ بولے، ''تب کیا آپ مرے نہیں تھے؟''

''مریں ہمارے دشمن۔ ہم تو پورے سو سال جئیں گے۔''

پنڈت جی کو اپنی ہی بے وقوفی پر ہنسی آ گئی۔ انھیں ہنستا دیکھ کر مولوی صاحب اور شیر سنگھ نے بھی اپنے اپنے گھر کے دروازے کھول دئے۔ جب ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ نواب رنگیلے بالکل نواب رنگیلے ہیں، تو قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ یہ خبر کچھ ہی منٹوں میں سارے گاؤں میں پھیل گئی اور سبھی لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

''دیکھی ہماری کرامت۔''

نواب رنگیلے نے شیر سنگھ کے گھر چائے پیتے ہوئے کہا، ''ہم جب چاہتے ہیں، لوگوں کو رُلا دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھر دیتے ہیں۔''

''اب تو ماننا پڑے گا۔'' شیر سنگھ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے قبول کر لیا، ''آپ بھی کبھی کبھی کمال کرتے ہیں۔''

''کمال کا ہے کا؟'' وہ بولے، ''ہماری بیگم کی تو جان نکلی جارہی ہے۔اس کے سارے گہنے لے کر بھوت ناتھ غائب ہوگیا ہے۔''

''تب تو آج رات میں ڈاکو بھوت ناتھ کو گرفتار کرنے آپ ضرور جائیں گے؟''

''اب تو جانا ہی پڑے گا، شیرا۔''

''میں جانتا تھا... اس گاؤں میں صرف ایک ہی مرد ہے۔''

''سو تو ہم ہیں ہی۔'' کہتے ہوئے نواب صاحب نے اپنا سینہ پھیلا دیا۔

چور مچائے شور

دشمنی دشمنوں سے ہوا کرتی ہے۔ اور دشمن کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ مثلاً، کتا۔ اگر کتے نے کسی آدمی کو کاٹ کھایا ہے تو آدمی کتے کو دشمن سمجھتا ہے۔ کسی شریف کا راستہ بلّی نے کاٹ لیا ہو اور بعد میں اس شریف کا بال بھی بانکا ہو تو اس کا بیر بلّی سے ہوسکتا ہے۔

اسی طرح کسی کی دشمنی شیر سے ہوسکتی ہے تو کسی کی چوہے سے۔ لیکن نواب رنگیلے کی دشمنی کسی سے تھی، تو وہ تھا اندھیرا۔ اندھیرے میں وہ ایسے گھبراتے تھے، مانو اندھیرا کوئی شیطان ہو، اور ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ اندھیرا ایک دم سامنے آجاتا تھا اور ہاتھ میں تلوار ہوتے ہوئے بھی وہ اندھیرے سے لڑ نہیں سکتے تھے۔ یہی ایک ایسا دشمن تھا جس کے آگے اس کے سارے ہتھیار بے کار ہو جاتے تھے۔

اسی وجہ سے شام ہوتے ہی وہ گھر میں گھس جاتے۔ آج بھی گھس گئے۔ بیگم مولوی علی ولی کے گھر ان کی بیوی کی خیر خیریت جاننے گئی تھی۔ نواب رنگیلے گھر میں اکیلے تھے۔ سوچ رہے تھے، کچھ ہی پلوں میں بلایا جائے گا۔ ڈاکو بھوت ناتھ کی تلاش میں گھنے جنگل میں جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اب اس آفت سے کیسے بچا جائے؟

کافی غور و فکر کرنے کے بعد انھیں ایک افلاطونی آئیڈیا سوجھا۔ فوراً انھوں نے برقع پہن لیا۔ اس لباس میں انھیں شیر سنگھ تو کیا، تھانے دار بندوقی لال بھی نہیں پہچان سکتا۔ گدگدی سے ہنسی ہنستے ہوئے وہ چارپائی پر لیٹے اور کچھ ہی پلوں میں ان کی آنکھیں بھی لگ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد بیگم گھر لوٹی۔ جیسے ہی اس نے چوکھٹ پر پیر رکھا، ویسے ہی چونک کر پیچھے کھسک گئی۔ یہ سوچ کر کہ کہیں غلطی سے کسی پڑوسی کے گھر میں تو نہیں گھس گئی۔ باہر آکر اس نے مکان کو غور سے دیکھا۔

یہی تو اس کا اپنا گھر تھا۔ تب اندر چارپائی پر خرّاٹے لے رہی دکھائی دینے والی عورت کون ہے؟

کچھ زیادہ سوچنے پر ایک ٹیڑھا سوال کھڑا ہو گیا۔ کہیں نواب صاحب نے دوسری شادی تو نہیں کر لی؟ اس خیال کا پیدا ہونا تھا کہ بیگم کا دل بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی وہ خود بیٹھ گئی۔ پھر سر پیٹ کر رونے لگی۔ تبھی شیر سنگھ نواب رنگیلے کو ڈھونڈتا ہوا آ پہنچا۔

''ارے بھابی!'' بیگم کو چیختی چلاتی ہوئی دیکھ کر وہ حیرانی سے بولا، ''اب تو سبھی لوگ جان گئے ہیں کہ آپ کے میاں زندہ ہیں۔ پھر یہ ماتم کیسا؟''

بیگم نے سر اٹھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا، ''تم سبھی مرد بدمعاش ہو۔'' وہ چیخی، تم سب نے مل کر یہ چکّر چلایا ہے۔ ہائے اللہ، میں تو برباد ہو گئی...!''

وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''آخر بات کیا ہے بھابی؟''

''تم خود ہی اندر جا کر دیکھ لو۔'' روتے ہوئے بیگم نے کہا۔

شیر سنگھ نے ادھ کھلے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو پل بھر کے لیے وہ بھی دھوکے میں آ گیا۔ پر دوسرے ہی پل اس کی نظر برقع پوش عورت کے پیروں پر پڑی۔ پیروں میں جوتیاں تھیں اور وہ بھی نواب صاحب کی۔ غور سے دیکھنے پر اس کی سمجھ میں کچھ آ گیا۔

''روؤ مت بھابھی!'' اس نے مڑ کر بیگم رنگیلی سے کہا، ''اس چڑیل کو میں ابھی گھسیٹ کر باہر لیے جاتا ہوں۔''

''سچ!'' بیگم کھڑی ہو گئی۔

شیر سنگھ گھر میں گھسا اور نواب رنگیلے کی کلائی تھام کر ایسے کھینچا کہ وہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

''اماں، یہ کیا حماقت ہے؟'' وہ بولے۔

''میں بھی آپ سے یہی پوچھنے والا تھا۔'' شیر سنگھ اپنے ساتھ باہر لاتے ہوئے کہہ رہا تھا، ''مرد لوگ مردوں سے پردہ کب سے کرنے لگے؟''

جب وہ دونوں بیگم رنگیلی کے سامنے سے گزرے تو بیگم کی سمجھ میں راز آ گیا۔ وہ ہنس دی۔

نواب رنگیلے شیر سنگھ کے ساتھ ساتھ قدم بڑھا رہے تھے۔ کچھ کہہ بھی رہے تھے، ''یہ تمھاری سمجھ میں نہیں آئے گا، شیرا۔''

''کیا؟''

''اس برقعے کا راز۔''

''اگر آپ کہیں تو... زیادہ بھلے ہی سمجھ میں نہ آئے، تھوڑا سا تو پلّے پڑ ہی جائے گا۔''

''تب سمجھو،'' نواب رنگیلے نے بتایا، ''یہ لباس ہم نے بھوت ناتھ کو چکما دینے کے لیے اپنایا ہے۔''

''ایں!''

شیر سنگھ ان پر قربان ہو گیا۔ وہ اس دھوکے میں تھا کہ نواب صاحب نے برقعہ اس لیے پہنا ہے تاکہ انھیں بھوت ناتھ کی تلاش میں نہ جانا پڑے۔ کوئی انھیں پہچان نہ سکے۔ حالانکہ یہی سچ تھا۔ لیکن نواب رنگیلے سچ پر بھی پردہ ڈالنا جانتے تھے۔

بڑی خوبی کے ساتھ انھوں نے اپنی عزت بچالی۔ لیکن اس سے مسئلہ کا حل نہیں نکلا۔ جیسے ہی انھیں خیال آیا کہ اس وقت شیر سنگھ انھیں ڈراؤنے جنگل کی طرف لیے جا رہا ہے، ان کے پیر کانپنے لگے۔ تبھی ایک معجزہ ہوا۔

مولوی علی ولی کی بیوی، چاندنی نیم پاگل تھی۔ کبھی رات میں مکان کے چھجّے پر چڑھ کر ڈسکو ڈانس کرتی تھی تو کبھی قبرستان میں جا کر اکیلی ہُتّو تو (کبڈّی) کھیلتی تھی۔ وہ چاندنی آج صبح سے غائب تھی۔ مولوی صاحب نے چھجّے پر جا کر دیکھا۔ قبرستان کا ایک چکّر لگایا۔ بلکہ سارے گاؤں کی دھول چھان کر دیر شام میں گھر لوٹ رہے تھے کہ ان کی نظر شیر سنگھ پر پڑی، شیر سنگھ کے ساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھتی ہوئی برقع پوش عورت پر پڑی۔

مولوی صاحب چونک پڑے۔ صبح ان کی بیوی نے گہرے ہرے رنگ کا برقعہ پہنا تھا۔ شیر سنگھ کے ساتھ جو عورت تھی، اس نے بھی گہرے رنگ کا برقعہ پہن رکھا تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ اور وہ شیر سنگھ پر ٹوٹ

پڑے۔ ''بے حیا! بے شرم!''

''کیا!'' وہ چونکا۔

''فوراً میری بیوی کا ہاتھ چھوڑ دے ورنہ یہاں زندہ دفن کر دوں گا۔''

''کیا کہتے ہو مولانا!''

''ابے بنیے!'' وہ کچھ آگے کہے اس سے پہلے مولوی صاحب اپنی چھڑی پر مضبوطی سے پکڑ جماتے ہوئے گرج اٹھے، ''میں شرافت سے کہہ رہا ہوں کہ میری بیوی کا ہاتھ چھوڑ دے اور تم کہتے ہو کہ میں بکتا ہوں؟''

شیر سنگھ راجپوت تھا اور جب کوئی اسے بنیا کہتا، اس کا خون کھول جاتا تھا۔

''مولانا، زبان کو لگام دو۔ ورنہ...'' کہتے ہوئے اس نے نواب رنگیلے کی کلائی چھوڑ کر آستین چڑھانا شروع کر دیا۔

''ورنہ تم کیا کر لوگے؟''

''رانا سنگرام سنگھ کے خاندان سے سیدھا اتر آیا ہوں،'' وہ کڑکا، ''میرا ایک تھپّڑ ہی آپ کو بنا ٹکٹ نگاڑا پور سے ڈھول پور بھیج دے گا۔''

مولوی صاحب نے دو قدم پیچھے ہٹ کر تلوار کی طرح اپنی چھڑی ہوا میں گھمائی، ''تم کیا اس دھوکے میں ہو کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں؟ اس چھڑی کا ایک وار تمھارا سر صرف گنجا ہی نہیں کرے گا، قلم کر کے رکھ دے گا۔''

''جرأت ہو تو چلا چھڑی۔''

''ہمّت ہو تو مارو تھپّڑ۔''

''پچھتاؤ گے!''

''چوری اور اوپر سے سینہ زوری!''

تبھی پنچایت کے ممبر جو پانچ اندھوں کی طرح وہاں سے گزر رہے تھے، تماشا دیکھنے رک گئے۔ اب

مولوی صاحب ان کی طرف مڑے، ''دیکھو اس بنیے کی تنگئی! ایک تو میری بیگم کو بھگا کر لے جا رہا ہے اور اوپر سے مجھے تھپّڑ مارنے کی دھمکی دیتا ہے! میں پنچوں سے درخواست کرتا ہوں کہ ...''

پنچوں کے مکھیا نے انھیں روکتے ہوئے پوچھا، ''آپ کی گھر والی کہاں ہے؟''

''ایں!'' ان کا چہرہ چوڑا ہو گیا۔

''ایں'' شیر سنگھ بھی حیرت زدہ رہ گیا۔

''کمبخت پھر بھاگ نکلی!'' کہتے ہوئے مولوی صاحب بیوی کی تلاش میں پھر ایک بار دوڑ گئے۔

شیر سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ نواب رنگیلے سٹک کر گئے کہاں ہوں گے؟ اس سوال کے جواب صرف دو ہی ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ گھر لوٹ گئے ہوں گے۔ دوسرا بھوت ناتھ ڈاکو کی تلاش میں گئے ہوں اور یہ ناممکن تھا۔ یہی سوچ کر وہ پنچوں کے ساتھ نواب رنگیلے کے گھر پہنچا اور باہر سے ہی آواز دی، ''نواب صاحب گھر پر ہیں کیا؟''

بیگم نے دروازے کے پیچھے سے کہا، ''وہ تو آپ کے ساتھ گئے تھے۔''

شیر سنگھ کو اب سچ مچ حیرانی ہوئی۔

''پریشان کیوں ہو رہے ہو شیرا؟'' پنچوں کے مکھیا نے اس کی صورت غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ سمجھ نہیں آتا۔''

''بھلا اس میں سمجھنے کی بات ہی کیا ہے۔ نواب صاحب گاؤں میں نہیں تو جنگل میں ہوں گے۔''

''یہی دلیل میرا دماغ قبول نہیں کرتا۔''

''کیوں؟''

نواب صاحب اتنی آسانی سے جنگل میں چلے جائیں یہ قریب قریب ناممکن ہے!''

''شیرا! دس ہزار روپوں کے انعام کا لالچ بزدلوں کو بھی مرد بنا دیتا ہے۔'' پنچوں کا مکھیا بول رہا تھا، ''ہمارے نواب صاحب تو خاندانی مرد ہیں۔ ہاں کبھی کبھی وہ آنکھیں چرا لیتے ہیں یہ اور بات ہے۔''

باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ بڑھے تو راستے میں پھر ایک بار مولوی علی ولی سے ملاقات ہو گئی۔

''لو پیڑا کھاؤ!'' انھوں نے پنچوں کے مکھیا کے آگے ایک پیڑا بڑھا دیا۔ مکھیا نے وجہ جاننے کے لیے منہ کھولا تو انھوں نے پیڑا منہ میں ٹھونس دیا۔ پھر باری باری سبھی کو ایک پیڑا کھلایا۔

''اب پوچھو کہ میں نے کس خوشی میں پیڑے بانٹے؟''

پیڑے ملائی کے تھے۔ اتنے مزے دار تھے کہ سبھی لوگ پیڑوں کی تعریف کرنے لگے۔

لیکن کسی کو وجہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ آخر مولوی صاحب کو ہی بتانا پڑا، ''بیگم مل گئی، میری چاندنی لوٹ آئی۔''

''ایں''، شیر سنگھ نے چونک کر پوچھا، ''کیا سچ مچ لوٹ آئی؟''

''ورنہ کیا مجھے پاگل کتّے نے کاٹا ہے کہ میں پیڑے بانٹوں؟''

''کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ آپ ہی کی بیوی ہے؟''

مولوی صاحب اس بیہودہ سوال سے بے تاب ہو گئے، ''تو کیا آپ کے باپ کی بیوی ہے؟''

''آپ تو بات بات میں کاٹنے کو دوڑتے ہیں، مولانا!''

''تم سوال ہی ایسے کرتے ہو کہ گدھے کو بھی بخار چڑھ جائے۔''

''ہو سکتا ہے وہ عورت، عورت ہی نہ ہو!''

''لاحول ولا...'' کہتے ہوئے مولوی صاحب نے تھوک دیا، ''مگر میری بیوی عورت نہیں تو کیا چیونٹی ہے؟ چمگادڑ ہے؟ کیا آپ لوگوں نے اپنی زندگی میں کبھی پانچ فٹ بڑا برقعہ پوش چمگادڑ دیکھا ہے؟ بولو، بولو! بولتے کیوں نہیں؟''

پنچوں نے شیر سنگھ کی طرف دیکھا۔ وہ سوچ کر بولا، ''یہ راز تو تبھی کھل سکتا ہے جب پردہ ہٹے۔''

''اماں، میری سمجھ میں تو یہی نہیں آتا کہ تمھیں شک کیوں ہے؟''

''صرف اس لیے کہ پچھلی بار میرے ساتھ جو برقعہ پوش عورت تھی، وہ حقیقت میں برقعہ پوش مرد تھا۔''

''ایں!'' اب کی بار مولوی صاحب چونکے، ''کیوں بمبئی سے کوئی نیا فیشن چلا ہے؟ کیا مردوں کی

عقل پر بھی پردہ پڑ گیا ہے؟''

''جی نہیں! نواب رنگیلے نے ڈاکو بھوت ناتھ کو گرفتار کرنے کے لیے یہ ٹوٹکا آزمایا ہے۔'' شیر سنگھ نے بات صاف کردی، ''لیکن یہ بات راز کی ہے۔''

یہ سوچنا تھا کہ مولانا صاحب اچھل پڑے۔ مانو کسی بیل نے انھیں دونوں سینگ مار کر پچھاڑ دیا ہو۔

بات دراصل یہ ہوئی تھی کہ بیوی کے غائب ہونے کی فریاد انھوں نے تھانے میں درج کروائی تھی۔ جب وہ سارے گاؤں کا کونا کونا چھان کر گھر لوٹے تو تھانے سے بلاوا آیا۔ وہ فوراً تھانے دوڑ گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ تھانے دار بندوقی لال نے دو برقعہ پوش عورتوں کو گرفتار کر رکھا ہے۔

دونوں کے برقعے ایک ہی رنگ کے تھے۔ دونوں میں ایک زور زور سے چلا رہی تھی۔ سنگیت کے ساتوں سُر گلے سے نکال رہی تھی۔ دوسری عورت خاموش تھی۔ کچھ کچھ شرمیلی بھی تھی، ماشاءاللہ۔

''چُن لو!'' تھانے دار بندوقی لال نے کہا، ''ان دونوں میں سے کون سی آپ کی گھر والی ہے؟''

مولوی صاحب نے سر کھجلایا۔ دونوں ہو بہو ایک سی لگ رہی تھیں۔

''اگر کچھ سمجھ میں نہ آئے تو ان دونوں مصیبتوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔''

لیکن مولوی صاحب کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ وہ اپنی نیم پاگل بیوی سے ویسے ہی پریشان تھے۔ اگر شادی کے وقت کسی نے انھیں اس طرح چننے کا موقع دیا ہوتا تو وہ قطعی چاندنی کو نہیں چنتے، لیکن اب بھی کیا بگڑا ہے؟ انھوں نے آگے سوچا۔ چننے کا ایک اور موقع ہاتھ آیا ہے تو کیوں نہ بہتر چیز پسند کی جائے؟

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر مان کر انھوں نے کونے میں خاموش کھڑی گونگی عورت کو چُن لیا۔ من ہی من اپنے افلاطون بھیجے کی داد دیتے ہوئے وہ تیزی سے گھر پہنچے اور نئی دلہن کو زنان خانے میں بند کر پیڑے بانٹنے نکل پڑے۔ لیکن انھیں کیا پتہ تھا کہ برقعے میں فریب ہے۔

''کیا بات ہے، مولانا؟'' ان کی سخت حالت دیکھ کر شیر سنگھ نے پوچھا، ''پسینہ پسینہ کیوں ہوئے جا رہے ہیں؟''

اب وہ کیا کرتے؟ پھر بھی کہا، ''اس وقت زمیں پھٹ جائے اور میں زندہ دفن ہو جاؤں تو مجھے کوئی

افسوس نہیں ہوگا۔''

''لیکن کیوں؟''

''پانچ فٹ بڑا چمگادڑ... برقعے میں... ہاں...!''

''آپ پاگل تو نہیں ہو گئے!''

''بالکل نہیں۔''

''تب...؟''

''تب کیا؟ چلو میرے ساتھ اور خود ہی دیکھ لو چمگادڑ کو!''

مولوی صاحب آگے آگے چلے۔ ہاتھ میں پیڑے کا ڈبّہ تھا۔ آدھے پیڑے اب بھی باقی تھے۔ غصّے میں وہ قدم قدم پر ایک ایک پیڑا منہ میں پھینکتے تھے اور 'لاحول ولا' بول کر تھوک دیتے تھے۔ شیر سنگھ ان کے پیچھے تھا۔ پانچ اندھوں کی طرح پنچ سبھی کے پیچھے قدم بڑھا رہے تھے۔

یہاں مولوی صاحب کے گھر میں نواب رنگیلے عیش کر رہے تھے۔ ویسے تھانے میں بھی وہ کم خوش نہیں تھے۔ چاہے رات تھانے میں گزرے یا مولوی صاحب کے گھر۔ اطمینان سے رات بیت جانے کی گارنٹی تھی۔ مولوی صاحب کے گھر میں تو انھیں اور بھی سکھ تھا۔ یہاں کھانے کے لیے کافی کچھ تھا۔ ملائی تھی، مکھن تھا۔ پکوڑیاں تھیں، بیسن کے لڈّو تھے۔ مربّہ تھا، گلاب جامن تھے۔

سب سے پہلے نواب رنگیلے نے ملائی پر ہاتھ آزمایا۔ پھر مکھن اور پکوڑیاں کھائیں۔ باری باری انھوں نے سارے برتن چاٹ کر ایسے صاف کر دیے کہ اب مانجنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تبھی باہر سے تالا کھلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ چپ چاپ آکر اپنی جگہ چار پائی پر بیٹھ گئے۔

مولوی صاحب آکر ان کی بغل میں بیٹھے۔ انھوں نے پیٹھ پھیر لی۔ شیر سنگھ اور پانچ پنچوں کے ممبر دروازے کے باہر چھپ کر کھڑے تھے۔ مولوی صاحب نے من ہی من طے کر لیا تھا۔ نواب رنگیلے کا مذاق اڑا کر وہ تھوڑا لطف لینا چاہتے تھے۔

''سنو چاندنی...!'' انھوں نے نوٹنکی شروع کرتے ہوئے ہونٹ کھولے اور اپنا ایک ہاتھ پیار سے

نواب رنگیلے کے کندھے پر رکھا۔

''ہوں ہوں ہوں!'' کہتے ہوئے نواب رنگیلے نے برقعے میں کندھا اچکایا۔

''جانِ من!'' وہ پھر بولے، ''اب یہ رات شادی کی پہلی رات تھوڑے ہی ہے کہ مجھے گھونگھٹ کھولنے کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔''

''ہوں ہوں ہوں ہوں ہوں...!''

''ہائے میری انارکلی۔ آخر مجھے اتنا کیوں تڑپا رہی ہو؟''

''ہوں...!''

''کیا مجھ سے ناراض ہو؟''

''ہوں...!''

''کس لیے؟ مجھ سے کیا کوئی غلطی ہوگئی۔''

''ہاں،،،غلطی سے نواب رنگیلے نے منہ کھولا، ''پکوڑیاں بالکل سڑے تیل سے بنی تھیں!''

''یہ تو چمگادڑ بولا!''

''ہم چمگادڑ نہیں،'' جوش میں آکر رنگیلے میاں کھڑے ہوگئے۔ چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔ پھر سینہ تان کر بولے ''ہم جنگ بہادر نواب رنگیلے ہیں!''

''تو جنگ بہادر صاحب!'' مولوی صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا، ''آپ ہمارے زنان خانے میں کیا کر رہے ہیں؟''

''آپ کی مدد!'' وہ بولے۔

''ایں؟''

''دیکھو، ہم نے آپ کے سارے برتن کیسے صاف کر دیے ہیں!''

مولوی صاحب نے دیکھا اور سمجھ گئے۔ ملائی لڈو، پکوڑیاں سب کچھ صاف ہوگیا تھا۔ انھوں نے سر پیٹ لیا لیکن دروازے کے باہر کھڑے ہوئے شیر سنگھ اور پنچایت کے ممبر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوئے

جا رہے تھے۔ ان سب کو ہنستے دیکھ کر نواب رنگیلے بھی قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

جب قسمت خراب ہوتی ہے تو لاکھ کوششیں کرنے پر بھی وہی ہوتا ہے، جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ نواب رنگیلے کی قسمت میں خطرہ مول لینا لکھا تھا، اب وہ کیا کریں، ڈاکو بھوت ناتھ کو چیلنج دینا لکھا تھا، تو اب انھیں کون بچا سکتا ہے؟

اب یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی قسمت میں زندہ واپس لوٹنا لکھا بھی تھا یا نہیں؟ اگر بھوت ناتھ کے ہاتھوں موت نہیں ہوئی، تو کوئی شیر یا چیتا ہی انھیں کچّا چبا سکتا ہے۔ ویسے ان کا دل دہلانے کے لیے گھنے جنگل کا اندھیرا کافی تھا۔

''شیرا!'' انھوں نے گھر کی طرف پلٹتے ہوئے کہا، ''ہم آخری بار بیگم کا چہرہ دیکھنا چاہتے ہیں۔''

شیر سنگھ چونکا، ''آخری بار کیوں؟''

''ہم مرد ہیں۔ میدانِ جنگ میں جا رہے ہیں۔ پتہ نہیں زندہ لوٹیں گے بھی یا نہیں۔''

بھلا اس بات پر شیر سنگھ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ وہ دونوں گھر لوٹے اور نواب رنگیلے نے بیگم کو گلے سے لگا لیا۔

''ہائے اللہ، یہ کیا؟''

''بیگم!'' وہ بولے، ''غلطی سے بھی ہم نے کچھ کر دیا ہو تو ہمیں معاف کر دینا۔''

''کیوں؟ کیا ہوا؟''

''بس یونہی سمجھ لو کہ ہم جا رہے ہیں۔''

''لیکن کہاں؟''

یہ تو مرنے کے بعد ہی پتہ چلے گا کہ ہمیں جنّت میں محل مل رہا ہے یا دوزخ میں جھونپڑی۔''

''لیکن آپ تو جنگل جانے والے تھے؟''

''جا رہے ہیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھنا۔''

''وہ تو رکھوں گی ہی۔''

''ہمیں برابر یاد کرتی رہنا۔''

''یہ تو کروں گی ہی۔''

''اور ہمارے مزار پر جمعرات جمعرات پھول چڑھانا مت بھولنا۔''

اب بیگم کو غصّہ آ گیا۔ وہ بول اٹھی، ''پہلے آپ جنت تو سدھارو۔''

یہ سننا تھا کہ نواب رنگیلے بھی تاؤ کھا گئے، ''جنّت نشین ہوں ہمارے دشمن۔ ہم بھی دشمن پر فتح پا کر ہی لوٹیں گے، ہاں!''

پھر کہنا کیا تھا؟ شیر سنگھ بھی کلائی تھام کر اسے گھسیٹتے ہوئے وہ خود ہی آگے بڑھ گئے۔ گلی محلّوں میں وہ سینہ تان کر چلتے رہے، لیکن جیسے ہی جنگل کا راستہ دکھائی دیا، ان کے پیر کانپنے لگے۔

گاؤں کی روشنیاں پیچھے چھوٹ گئی تھیں۔ آگے صرف اندھیرا تھا۔ انھوں نے دل ہی دل میں اللہ کو یاد کیا اور جنگل کی راہ پر اکیلے آگے بڑھ گئے۔

کچھ دور جا کر پلٹ کے دیکھا تو شیر سنگھ پرچھائیں سا نظر آیا۔ کمبخت کیل کی طرح کھڑا تھا۔ اب انھوں نے شیر سنگھ پر لعنتیں برسائیں۔ گھر لوٹ جانے کی ساری امیدوں کو بھول جانا ہی بہتر تھا۔ جنگل میں وہ قدم بڑھا گئے۔

سائیں سائیں کرتی ہوا چل رہی تھی۔

پیڑوں کے پتّے ایسی ڈراؤنی آوازیں کر رہے تھے مانو سوسو چڑیلیں کھل کر ہنس رہی ہوں۔ ایسے ماحول میں نواب رنگیلے **'جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو'** بار بار دہراتے ہوئے، سر سے پیروں تک کانپتے ہوئے، سوچ سوچ کر پاؤں رکھ رہے تھے۔

کبھی وہ دائیں طرف دیکھ لیتے تھے تو کبھی بائیں طرف۔ کبھی آگے دیکھ لیتے تھے تو کبھی پیچھے۔ چاروں طرف ان کے لیے ڈر کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ انھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے آگے کہیں کہیں سے کوئی پریت پھوٹ نکلے گا اور ان کی گردن دبوچ دے گا۔ اس ڈر کی وجہ سے وہ ڈاکو بھوت ناتھ کو بھول گئے تھے۔

تھوڑی دور جا کر وہ رک گئے۔ اب اور آگے بڑھنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ہمت نہیں تھی۔ شیر، چیتے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ پیڑ پر چڑھنے لگے تو برقعے کی وجہ سے پریشانی ہونے لگی۔ انھوں نے برقعہ اتار کر پھینک دیا۔ پھر جلدی جلدی اونچے پیڑ پر چڑھ کر مضبوط ڈالی پر بیٹھ گئے۔

کچھ اطمینان ہوا۔ کچھ پلوں کے لیے بلا ٹل گئی۔ جان میں جان آئی۔ کم سے کم وہ یہاں محفوظ تو تھے۔ تبھی ان کی نظر نیچے گئی اور پھر کپکپی شروع ہوگئی۔ آنتیں ٹوٹنے لگیں۔ دل دھڑک اٹھا۔ نیچے انھوں نے پریت دیکھا تھا۔

حقیقت میں وہ پریت نہیں تھا۔ ان کا اپنا ہی برقعہ تھا۔ ایک پودے پر ایسے پڑا تھا جیسے کوئی پریت ہاتھ پھیلا کر سطح سے اٹھ رہا ہو۔

ڈاکو بھوت ناتھ وہیں سے گزر رہا تھا۔ وہ اسی پودے کے قریب آیا اور اس کی نظر بھی برقعے پر پڑی۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ بھی چونک گیا۔ وہ کچھ سوچے اس سے پہلے زور کی ہوا چلی۔ برقعہ اڑا۔ پریت اڑا اور بھوت ناتھ کی جانب لپکا۔

بھوت ناتھ کے پیروں سے زمین کھسک گئی۔ وہ چلایا، ''بھوت! بھوت!!'' یہ آواز سن نواب رنگیلے ایسے کانپے کہ پیڑ پر سے پھسل کر سیدھے نیچے دھنس گئے۔ نیچے بھوت ناتھ کھڑا تھا۔ بھوت ناتھ کا بھرتہ بن گیا۔ منہ کے بل ایسے گرا کہ پھر اٹھ نہیں سکا۔

نواب رنگیلے تیزی سے اٹھ کر پھر پیڑ پر چڑھ گئے۔ رات بھر پیڑ پر بیٹھے بیٹھے خوں خوار جانوروں کی آوازیں سنتے رہے۔ پریت کے ڈر سے کانپتے رہے۔ اللہ کو یاد کرتے رہے۔

جیسے جیسے رات بیتی۔ صبح کی پہلی کرنوں کے ساتھ نواب صاحب آہستہ آہستہ نیچے کھسک آئے۔ انھوں نے کیا دیکھا کہ پیڑ کے پاس کوئی برقعے میں لپٹا ہوا اوندھے منہ پڑا ہے۔ برقعہ ہٹا کر دیکھا تو حیران رہ گئے۔

بھوت ناتھ ڈاکو اتنی آسانی سے ان کے پھندے میں پھنس جائے گا، یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے

تھے۔ انھوں نے بے ہوش پڑے بھوت ناتھ سے کہا، ''جب گیدڑ شیر سے ٹکراتا ہے تو اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔'' نواب رنگیلے نے اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالا اور گاؤں کی طرف چل دیے۔

صبح ہو چکی تھی۔ لوگ باگ اپنے اپنے آنگن میں اور چبوتروں پر مسواک کر رہے تھے۔ گلے سے عجیب و غریب آوازیں نکال رہے تھے۔ تبھی ان لوگوں کی نظر نواب رنگیلے پر پڑی۔ سبھی کی آنکھیں چوڑی ہو گئیں۔ منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

''نواب صاحب!'' طیب علی بوری نے کلّی کرتے ہوئے پوچھا، ''صبح صبح تم کس کافر کو اٹھا لائے؟''

''وہی جس کا نام سنتے ہی تمھاری نانی مر جاتی تھی۔''

''بھوت ناتھ! اسے تم نے...!''

جب یہ خبر شیر سنگھ نے سنی تو وہ پھولوں کی مالا لے کر نواب صاحب کا استقبال کرنے دوڑا آیا، ان کے گلے میں مالا ڈالتے ہوئے وہ بولا، ''بھگوان قسم، اب کے تو آپ نے سچ مچ کمال کر دیا۔''

''اماں، اس میں کمال کا ہے کا؟ ہاں، اگر ہم شیر چیتے کو ماریں تو اسے کمال کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو چوہا ہے، چوہا! لو سنبھالو اسے!'' کہتے ہوئے انھوں نے بھوت ناتھ کا بے ہوش جسم شیر سنگھ کو سونپ دیا۔ جب پنچوں کو اس بات کا پتہ چلا تو انھوں نے نواب صاحب کی عزّت افزائی کی اور جیسا کہ طے تھا دس ہزار روپے انعام نقد میں دیے۔
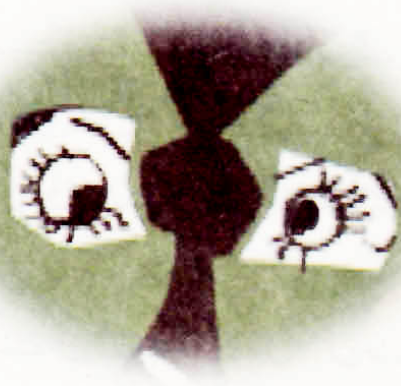
پہلوان خوں خوار خان

یہ تو تم سبھی جانتے ہو کہ نگاڑا پور نواب رنگیلے کا گاؤں ہے، لیکن یہ گاؤں ہے کہاں؟ اس سوال کا جواب ہم کھل کر نہیں دے سکتے۔ البتہ ہم اتنا ضرور بتائیں گے کہ نگاڑا پور ہند پاک کی مغربی سرحد پر کہیں ہے۔ باقی تم سوچ لو۔

نگاڑا پور سے تم پاکستانی گاؤں طبلا گنج دیکھنا چاہو تو بنا دوربین کے دیکھ سکتے ہو۔ کبھی کبھار نواب رنگیلے کی مرغیاں شام ہونے پر بھی دڑبے میں دکھائی نہیں دیتیں تب وہ ان کی تلاش میں سرحد لانگھ کر وہاں چلے جاتے ہیں۔ وہاں کا مکھیا دہاڑ علی کبھی کبھی انڈوں کی تلاش میں یہاں، نگاڑا پور بھی آ جاتے جاتے رہتا ہے۔

دہاڑ علی آج صبح ہی آ دھمکا۔ ابھی مِل کا سائرن بھی نہیں بجا تھا کہ وہ نواب رنگیلے کے دروازے پر دہاڑا۔ ''اماں، نواب صاحب! کیا آپ کو جگانے کے لیے مجھے مِل کا سائرن بجانا ہوگا؟''

نواب رنگیلے نے اٹھ بیٹھتے ہوئے کہا، ''آپ کی دہاڑ کافی ہے، میاں دہاڑ علی۔''

''پھر سے دہاڑوں؟''

''نہیں۔ ایک دہاڑ کافی ہے۔'' کہتے ہوئے وہ جلدی جلدی دروازے تک آئے اور اندر سے لگا تالا کھول دیا۔ دہاڑ علی دہلیز سے دو قدم آگے بڑھا اور نواب رنگیلے سے تین بار گلے ملا۔ نواب رنگیلے نے اسے چارپائی پر بٹھاتے ہوئے پوچھا، ''کہو میاں، آج علی الصبح ہی ہماری یاد کیسے آ گئی؟''

''اب تو ہم روزانہ یہاں آیا کریں گے۔''

''کیا طبلا گنج کی مرغیاں ہڑتال پر اتری ہیں؟''

اس نے مسکرا کر جواب دیا، ''ہڑتالیں تو آپ لوگوں کی قسمت میں لکھی ہیں۔ ویسے طبلا گنج کے لوگ اب روزانہ مرغیاں کھائیں گے اور انڈے آپ لوگوں کے لیے چھوڑ دیں گے۔''

''وہ کیسے؟''

''کیا آپ نے آج کا اخبار نہیں دیکھا؟''

''کچھ خاص؟''

اس نے اپنا اخبار کھول کر نواب رنگیلے کے سامنے بچھا دیا، ''پڑھ لو۔''

اخبار انگریزی کا تھا اور انگریزی نواب صاحب کی زبان نہیں تھی۔ وہ بولے، ''تم ہی پڑھ کر سنا دو۔'' ویسے دہاڑعلی کے لیے بھی کالا اکشر بھینس برابر تھا۔ پڑھنا لکھنا وہ نہیں جانتا تھا۔

''تم یہ تو جانتے ہی ہو گے کہ اس میں کس مضمون پر خبریں چھپی ہیں!''

''سبھی۔'' وہ بولا۔

''تب پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ زبانی بتا دو۔''

اس کی زبان چلے اس کے پہلے شیر سنگھ آ پہنچا۔ اسی نے سرخی پڑھی اور اچھل پڑا۔ نواب رنگیلے چونکے، ''اماں کیا ہوا؟''

''بہت برا۔''

''آسمان ٹوٹ پڑا۔''

''طبلا گنج والے کہتے ہیں کہ نگاڑاپور، طبلا گنج کا حصّہ ہے۔ اس لیے نگاڑاپور کو پاکستان میں شامل کر دیا جائے۔''

''ایں...!''

بات غلط نہیں تھی۔

لیکن بات سچ بھی نہیں تھی۔ جب ہند پاک کا بٹوارہ ہوا تھا، تب طبلا گنج، نگاڑاپور کا ہی حصّہ تھا۔ بٹوارہ کرنے والے ظالم نے ایسی تلوار چلائی کہ ایک ہی وار میں نگاڑاپور کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک حصّہ

پاکستان میں چلا گیا جسے آج لوگ طبلا گنج کے نام سے جانتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ پنچوں نے بھی یہ خبر سنی اور وہ سیدھے نواب رنگیلے کے گھر دوڑ آئے۔

''پکار سنگھ!'' دہاڑ علی نے پنچوں کے مکھیا سے کہا، ''اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟ نگاڑاپور طبلا گنج میں شامل ہوجائے، یہ تو ہم سب کے لیے خوشی کی بات ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''زمین کا جو آدھا حصّہ ہندوستان میں رہ گیا ہے وہ بھی پاکستان سے جڑ جائے تو ہم سب پھر ایک ہوسکتے ہیں۔''

پکار سنگھ سوچ کر بولا، ''سوال صرف ہمارے ایک ہونے کا ہے۔ ٹھیک؟''

''اور کیا؟''

''تب کیوں نہ ہم طبلا گنج کو ہی واپس ہندوستان میں لے آئیں؟''

دہاڑ علی نے اس کا منہ توڑ جواب دیا، ''اب یہ پیچھے ہٹنے والی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔''

''کیوں؟''

''تم تو راجپوت ہو، پکار سنگھ! آدھا نگاڑاپور ترقی کی طرف بڑھ گیا ہے سوال باقی آدھے کے آگے بڑھنے کا ہے۔ یہ نہیں کہ جو حصّہ آگے بڑھا ہے اسے پیچھے گھسیٹا جائے۔''

''ناممکن!'' اب تک خاموش بیٹھے نواب رنگیلے چلائے، ''یہ نہیں ہوسکتا۔ جب تک ہماری سانس میں سانس ہے، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔''

سبھی نے نواب صاحب کی دلیل کی زوردار وکالت کی۔ دہاڑ علی اپنا اخبار اٹھا کر جاتے ہوئے بولا، ''خیر سوچنے میں کیا حرج ہے؟ ہمیں تھوڑے ہی جلدی ہے!'' اور نواب رنگیلے کے ساتھ سبھی سوچ میں پڑ گئے۔

صبح صبح دہاڑ علی کیا دہاڑا کہ سارا گاؤں چکّر میں آگیا۔ جہاں دیکھو وہاں ایک ہی سوال پر بحث

ہور ہی تھی، کیا نگاڑا پور پاکستان میں شامل ہو جائے گا؟

''اماں، یہ گڑیوں کا کھیل تھوڑے ہی ہے کہ ایک گڑیا ادھر سے اٹھائی اور ادھر رکھ دی۔'' مولوی علی ولی اپنے گروہ والوں سے کہہ رہے تھے،''طبلا گنج والے کوئی چال چلیں گے تو ہم ان کا منہ توڑ جواب دیں گے۔ آنے والے چناؤ میں اگر آپ لوگوں نے ہمیں ووٹ دیا تو ہم طبلا گنج تو کیا، سارے پاکستان کو ہی نگاڑا پور میں گھسیٹ لائیں گے۔ ہاں...!''

اُدھر دوسری چھاؤنی میں لوگوں نے پنڈت ماکھن لال سے مشورہ کیا۔ وہ بول اٹھے،''ارے کس کی ماں نے شیرنی کا دودھ پیا ہے جو نگاڑا پور کی طرف آنکھیں اٹھائے۔''

''آپ کیا کرلیں گے، پنڈت جی۔'' کلّو کلہاڑی نے فقرہ کسا،''امریکہ والے پاکستان کے ہمدرد ہیں۔''

''اگر یہ سچ ہے تو اگلے چناؤ میں آپ لوگ مجھے ہی ووٹ دیں، طبلا گنج کے ساتھ میں امریکہ کو بھی نگاڑا پور میں گھسیٹ نہ لایا تو میرا نام ماکھن لال نہیں۔''

''یہ کچھ بات ہوئی۔'' کلّو کلہاڑی نے اپنے ساتھی سے کہا،''ویسے پاکستان میں رکھا ہی کیا ہے؟''

''اسی لیے تو پنڈت جی امریکہ کو گھسیٹ رہے ہیں۔''

''اور... ہم پوری تعداد میں انھیں ووٹ دیں تو مجھے امید ہے، امریکہ اور یورپ کے پیچھے روس بھی کھنچا چلا آئے گا۔''

شیر سنگھ، جو چپ چاپ سب کی باتیں سن رہا تھا، بولا،''یہاں آپ لوگ محلوں کے خواب دیکھ رہے ہیں اور وہاں تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔''

سبھی چونکے،''تیاریاں؟ کاہے کی؟''

''نگاڑا پور ہڑپنے کی!''

''وہ کیسے؟''

طبلا گنج کا ایک ایک مرد میدان جنگ میں کود پڑنے کے لیے تیار ہے۔''

''تو ہم کہاں سوئے ہوئے ہیں۔'' پنڈت جی نے منہ کھولا۔

مولوی علی ولی کی چھاؤنی میں بھی کافی جوش وخروش نظر آ رہا تھا۔ ''میرا ایک ایک مرد سو سو دشمنوں کے طبلے توڑنے کے لیے کافی ہے۔'' وہ اپنے گروہ والوں سے کہہ رہے تھے، ''میرے شیر، میرے باگھ، میرے چیتے! یہ مت بھولنا کہ تم دشمنوں کو شہید کرنے جا رہے ہو، نہ کہ خود شہید ہونے۔ جہاں تک ممکن ہو، اپنی جان سلامت رکھنا۔ تمھاری ایک جان سلامت یعنی کہ ہمارا ایک ووٹ سلامت۔ بڑھو آگے! کرو فتح! دھرتی ماتا تمھیں پکار رہی ہے۔''

نگاڑا پور کے شاعر طوطی نے نغمۂ جنگ شروع کر دیا، ''سر کٹا سکتے ہیں ہم، پر سر جھکا سکتے نہیں۔'' اور سارے لونڈے لپاڑے، مرد بوڑھے جو حاضر تھے، آستین چڑھا کر آگے بڑھ گئے۔ کسی کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا تو کسی کے ہاتھ میں پتھر۔ کسی کے ہاتھ میں زنگ لگی تلوار تھی تو کسی کے ہاتھ میں اورنگ زیب کے زمانے کی بندوق۔

پنڈت ماکھن لال کی تقریر اب بھی جاری تھی، ''یہ معاملہ ہندوستان پاکستان کا نہیں، نگاڑا پور اور طبلا گنج کا ہے، اور اس کا فیصلہ بھی ہم ہی لوگ کریں گے۔'' تقریر کا اب کلائی میکس بنا، ''آخری فیصلہ کیا ہوگا یہ ہم سبھی جانتے ہیں۔ طبلا گنج کے طبلے ٹوٹ جائیں گے اور پیٹیاں پھوٹ جائیں گی۔ جاگو۔'' وہ اچانک چلائے ''اور آگے بڑھو۔ یہ مٹّی تمھیں پکار رہی ہے۔''

تبھی اس گروہ سے جڑے ہوئے شاعر طوطی نے نغمۂ جنگ چھیڑ دیا، ''وطن کی راہ میں وطن کے نوجواں شہید ہو۔''

یہ سننا تھا کہ سبھی مرد سینہ تانے آگے بڑھ گئے، صرف تین مردوں کو چھوڑ کر۔ ان میں سے ایک تھے نواب رنگیلے۔ ایسا تو ہم قطعی نہیں کہہ سکتے کہ وہ موت سے ڈرتے تھے۔ اس لیے یہ کہنا ٹھیک رہے گا کہ امن پسند تھے۔ جنگ کے نگاڑے سنائی کیا پڑے، وہ سیدھے ہی اپنے گھر میں گھس کر چارپائی کے نیچے چھپ گئے۔

''یہ کیا؟'' بیگم رنگیلی بول اٹھی۔

''چُپ!''

''میں تو سوچ رہی تھی، اس گاؤں میں صرف ایک ہی مرد ہے۔''اس نے مسکراتے ہوئے جوڑا۔

''اور وہ مرد بھی میدانِ جنگ میں مارا گیا تو؟''نواب رنگیلے چار پائی کے نیچے سے دلیل دے رہے تھے،''یہ گاؤں یتیم نہ ہو جائے گا؟''

''لیکن...''

''اس مرد کو زندہ رہنا ہوگا۔ چاہے چار پائی کے نیچے ہی کیوں نہیں گھسنا پڑے۔''

''بھابھی جان!''اسی وقت شیر سنگھ نے باہر سے آواز دی،''ہمارے نواب صاحب بھیگی بلّی بنے گھر میں بیٹھے ہیں یا میدان جنگ میں گئے ہیں؟''

''اماں، وہ تو شہید ہونے کب کے چلے گئے۔'' بیگم کوئی جواب دے اس کے پہلے ہی نواب صاحب کے ہونٹ کھل گئے،''اور تم بھی فوراً دفع ہو جاؤ۔''

''تب یہ آواز کس کی ہے؟''شیر سنگھ نے ہنس کر پوچھا۔

اپنے بے وقوفی کا احساس ہوتے ہی نواب رنگیلے نے سر پیٹ لیا۔ چار پائی کے نیچے سے رینگتے ہوئے وہ فوراً باہر آئے اور شیر سنگھ سے کہا،''دراصل بات یہ ہے کہ ہم اہنسا کو مانتے ہیں۔ ہاں... اور خون خرابے سے دور رہتے ہیں۔ ویسے بھی ایک بھائی اپنے بھائی کا گلا کیسے کاٹ سکتا ہے؟

''کیا مطلب؟''

''تم کیا نہیں جانتے کہ ہمارے بھائی گلابی خان طبلا گنج میں رہتے ہیں۔ اپنی بھابھی، چاچا چچی، پھوپھا پھوپھی، نانا نانی پر ہم تلوار چلانے کی سوچ بھی کیسے سکتے ہیں۔''

''اور وہ سبھی تلوار اٹھا کر نگاڑا پور کی طرف دیکھیں تب؟''

''تب تو جبڑا توڑ جواب دینا ہمارے لیے واجب ہو جائے گا۔''

''تو سمجھ لو کہ وہ لوگ صرف آنکھیں ہی نہیں، پیر بھی اٹھا کر سرحد کی طرف بڑھ چکے ہیں۔''

''ایں!!!''

تین مردوں میں سے ایک تو میدان جنگ میں کود پڑنے کے لیے راضی ہو گیا۔ لیکن ابھی دو مرد بچے تھے، پنڈت ماکھن لال اور مولوی علی ولی۔

پنڈت جی نے اپنے مکان کی کھڑکی کھول دیکھا کر تو انھیں اچانک ہی تعجب ہوا۔ پڑوس والے گھر کی کھڑکی میں مولوی صاحب بیڑی پھونک رہے تھے۔ آنکھیں چار ہوتے ہی دونوں چونک گئے۔

''کیوں پنڈت جی!'' مولوی صاحب نے کتراتے ہوئے کہا، ''جب مٹّی پکار رہی ہے تب آپ گھر میں کیا کر رہے ہیں؟''

''میں؟ میں تو گاؤں کی حفاظت کے لیے رُکا ہوا ہوں۔ آخر کوئی تو مرد یہاں رہنا چاہیے۔'' وہ بولے، ''ویسے میں بھی آپ سے یہی سوال پوچھنے والا تھا۔''

''کیا؟''

''بہادر مرد تو میدانِ جنگ میں سب سے آگے ہوتا ہے اور آپ ہیں کہ زنان خانے میں بیٹھے ہیں۔''

''اس کی وجہ ہے۔''

''کیا میں جان سکتا ہوں؟''

مولوی صاحب نے گلا کھنکھار کر جواب دیا، ''گاؤں کو بچانے میں اگر تم شہید ہو جاؤ تب کوئی تو چاہیے جو گاؤں کی ماں بہنوں کی عزت کی حفاظت کر سکے۔''

پنڈت جی نے دھڑام سے اپنی کھڑکی بند کر لی۔

دونوں چھاؤنیوں کے جوان الگ الگ راستوں سے آگے بڑھ کر چوراہے تک آئے اور ایک ہو گئے۔ یہاں سے نناوے سال کے بوڑھے نے جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ آگے آگے چلا۔ نعرے بازی کرتی ہوئی بھیڑ پیچھے پیچھے چلی۔

جیسے جیسے سرحد قریب آتا گیا لوگوں کا جوش ٹھنڈا پڑتا گیا۔ کلّو کلہاڑی پیچھے کھسکتا گیا۔ نواب رنگیلے نے اسے دیکھ لیا۔ کیونکہ سب سے پیچھے وہ ہی تھے۔ بول اٹھے، ''سٹک کر کہاں جا رہا ہے؟''

''قبر کھودنے۔'' اس نے فوراً جواب دیا، '' لگتا ہے آج دونوں طرف کافی لاشیں گریں گی۔''
نواب رنگیلے کے پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ کچھ سوچ کر انھوں نے آہستہ سے پوچھا، ''تمھیں مدد کی ضرورت ہے؟''
''ایں!''
''ڈھیر ساری قبریں تم اکیلے کیسے کھود پاؤ گے؟ یہ کام تو کم سے کم دس آدمیوں کا ہے۔ دس نہ سہی دو سہی۔''
تبھی شیر سنگھ نے نواب صاحب کی کلائی تھام لی، '' آپ یہاں پیچھے کیا کر رہے ہیں؟''
''ہم تو نظر رکھے ہیں کہ کوئی کھسک نہ جائے۔''
''لیکن آپ کی ضرورت تو آگے ہے۔''
''آگے کیوں؟''
''جنگ کا تجربہ سب سے زیادہ آپ کو ہے۔'' شیر سنگھ نے دلیل دیتے ہوئے جوڑا، '' آپ ہی نے تو بتایا تھا کہ آزادی سے پہلے انگریزوں کی فوج پر آپ آفت کی طرح کیسے ٹوٹ پڑے تھے۔''
''ہاں، سو تو ہے۔'' وہ جوش میں آگئے، ''ہم نے اکیلے ہی بیس ہزار کی فوج کے چھکے چھڑا دیے تھے۔'' تب یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ننانوے سال کا بوڑھا جھنڈا لے کر آگے چلے اور آپ پیچھے؟''
''یہ تو ہماری عزت کا سوال ہے۔ چلو!'' کہتے ہوئے انھوں نے تلوار نکالی اور ہوا میں دو تین وار کرتے ہوئے سب سے آگے ہو لیے۔
دوسری طرف سے دہاڑ علی ہاتھ میں بندوق لیے ہوئے بڑھا آ رہا تھا۔ پیچھے طبلا گنج والے ''اللہ اکبر'' کے نعرے لگاتے ہوئے قدم بڑھا رہے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو گلے میں کفن باندھ کر آئے تھے۔ کیا پتہ، مرنے کے بعد کفن ملے بھی یا نہیں۔
دونوں فوجوں میں اپنے اپنے دیش کے لیے مر مٹنے کی تمنا نظر آ رہی تھی۔ پھرتی سے قدم بڑھاتی ہوئی دونوں فوجیں سرحد تک آ پہنچی تھیں۔

''نواب صاحب۔'' دہاڑ علی ہوا میں فائر کرتے ہوئے سرحد کی ایک طرف سے دہاڑا،''اب بھی وقت ہے سوچ لو۔''

نواب رنگیلے اس وقت سینہ تانے ہوئے تھے۔ بولے،''دہاڑ علی! بندوق بندوق سے ٹکراتی ہے تلوار سے نہیں۔''

یہ سننا تھا کہ اس نے اپنی بندوق پھینک کر قریب میں کھڑے ہوئے ایک ساتھی کی تلوار جھپٹ لی۔ پھر پوچھا،''اب؟''

''یہ ہوئی مردوں والی بات۔لیکن خون خرابہ تو ہوگا ہی۔ یاد رہے یہ جھمیلا تم لوگوں نے کھڑا کیا ہے اور اس کے ذمے دار بھی تم ہو گے۔''

''خون خرابہ تو ہم بھی نہیں چاہتے۔''

''تب کیوں نہ ہم اپنے اپنے پہلوانوں کو بھڑا دیں!'' نواب رنگیلے بول اٹھے، جان بچانے کا انھوں نے ایک اچھا حل سوچ لیا تھا،''ایک پہلوان تم اتارو۔ایک پہلوان میدان میں ہم اتارتے ہیں۔''

''فرسٹ کلاس۔'' دہاڑ علی کو بھی ٹوٹکا جچ گیا،''ہمارا پہلوان جیت جائے گا اور نگاڑاپور طبلا گنج میں شامل ہو جائے گا۔''

''اور غلطی سے ہمارا پہلوان جیت گیا تو؟''

دہاڑ علی کو کہنا پڑا۔''تب طبلا گنج نگاڑاپور میں مِل کر ایک ہو جائے گا۔''

پھر دونوں سردار، سرداروں کی طرح گلے ملے اور ایک ہفتہ کے بعد کشتی کا پروگرام طے کیا۔ یہ فیصلہ سرحد کے اِدھر اُدھر، دونوں طرف کے لوگوں نے منظور کر لیا۔ ویسے بھی دونوں طرف کے لوگ خون خرابہ پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ تو امن سے رہنا چاہتے تھے۔لیکن لیڈران اپنی تقریروں سے اور شاعر لوگ اپنے نغمۂ جنگ سے بھولے بھالے عوام کو بہکا دیتے تھے۔

جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی امن ہو گیا۔نواب رنگیلے اپنی فوج کے ساتھ ایسے لوٹے مانو جنگ جیت کر آئے ہوں۔ یہ خبر مولوی علی ولی نے سنی تو انھیں بے حد خوشی ہوئی۔ان کو یقین ہو گیا کہ اب ان کے

سارے رائے دہندگان سلامت ہیں۔ پنڈت ماکھن لال بھی اتنے ہی مسرور تھے۔

وہ دونوں نواب رنگیلے کا استقبال کرنے دوڑ پڑے۔ دونوں نے باری باری ان کے گلے میں پھولوں کی مالا ڈالی اور باری باری لچھے دار تقریریں کیں۔ نواب رنگیلے کی جنگی تدبیر کی تعریف کی۔ نواب صاحب پھول کر کپّا ہو گئے۔ لیکن بڑی مصیبت اب کھڑی ہوئی۔ نگاڑا پور کے کس پہلوان کو طبلا گنج کے پہلوان کو مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا جائے؟ پنچوں نے گاؤں کے بزرگوں کو مشورے کے لیے بلایا، جن میں ننانوے سال کا بوڑھا بھی شامل تھا۔ ان دنوں جو چستی ان میں نظر آرہی تھی، وہ نگاڑا پور کے جوانوں کو بھی شرما رہی تھی۔ اسے پچھلے ہفتے ہی پنچوں کے مکھیا پکار سنگھ کی بیٹی نے فریاد کی تھی کہ تالاب پر سے پانی بھر کر آتی لڑکیوں کے گگرے غلیل سے کوئی مردوا پھوڑ ڈالتا ہے اور شک کی سوئی ننانوے سال کے بوڑھے کی طرف اشارہ کرتی تھی۔

میٹنگ شروع ہوتے ہی کونے میں کھڑا ننانوے سال کا بوڑھا کھڑا ہو گیا اور سبھی کے بیچ میں کود پڑا۔ پھر بولا، ''بتیس میں سے ابھی ہمارے دو دانت سلامت ہیں اور ہم طبلا گنج کے کسی بھی رستم کو کم سے کم دو بار ہرا سکتے ہیں۔ اگر ہمارے تین دانت سلامت ہوتے تو...''

وہ کچھ آگے کہے اس سے پہلے مولوی مولوی علی ولی نے تقریر جھاڑنا شروع کر دی۔ پنڈت ماکھن لال نے انھیں اپنی بھاری آواز سے چپ کر دیتے ہوئے ایک پہلوان کا نام سجھایا، '' پکوڑی مل جیسا پہلوان آج تک دنیا بھر میں پیدا نہیں ہوا۔ یہی تو وجہ ہے کہ ہنومان اکھاڑے کا نام سن کر ہی اچھے اچھے تیس مار کھاؤں کو بھی بخار چڑھ جاتا ہے۔ آپ سبھی سے میری درخواست ہے کہ نگاڑا پور کی طرف سے پہلوان پکوڑی مل کو ہی بھیجا جائے گا۔''

''لاحول ولاقوۃ۔'' مولوی صاحب نے تھوکنے کے لیے جگہ ڈھونڈتے ہوئے لعنت برسائی۔ لیکن مجمعے میں تھوکنے جگہ نہ ملنے کی وجہ سے اسے گلے سے اتار گئے۔ پھر پنڈت جی کی طرف دیکھتے ہوئے آگے کہا، ''اماں کس کا نام لے لیا، صبح صبح! وہ بھی کوئی پہلوان ہے۔ ہاں، اگر کسی کو میدان میں اتارنا ہی ہے تو کیوں نہ پہلوان غضب علی کو اتارا جائے؟ وہ گاما پہلوان کے استاد کے بیٹے کے ماموں کا بھانجا ہے۔ اس

''کیا کہتے ہو، گرو!'' ایک چیلا بول اٹھا، ''یہ تو ہمارے اکھاڑے کی عزت کا سوال ہو تب سارے سوال بے معنی ہو جاتے ہیں۔ من بڑا رکھو بھائیوں! بھلے ہی لوگ اسے فتح یاب قرار دیں۔''

جب غضب علی کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ گھبرا گیا۔ اس کے پاس اب کوئی اور حل نہیں تھا، سوائے اس کے کہ وہ چار پائی سے لگ جائے۔ اور سچ مچ ہی اسے بخار چڑھ گیا۔

یہ خبر پکوڑی مل نے سنی اور اس کے ہوش حواس اڑ گئے۔ گاؤں چھوڑ کر وہ بھاگ نکلا۔ نگاڑا پور میں ایمرجنسی حالت پیدا ہو گئی۔ ایسی نازک حالت آج سے پہلے کبھی کسی نے نہ جانی تھی، نہ سنی تھی۔ سب کے چہرے پر ایک ہی سوال تھا۔ اب کیا...؟

یہی موقع تھا سبھی کو یاد دلانے کا۔ ''شاید آپ لوگ یہ بھول گئے ہیں کہ ... '' شیر سنگھ بولا، ''ہمارے گاؤں میں صرف ایک ہی مرد ہے۔''

نواب رنگیلے اس کے پاس کھڑے تھے۔ سینہ چوڑا کر بولے ''سو تو ہم ہیں ہی۔''

پنچوں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے فوراً فیصلہ سنا دیا، ''تب خونخوار خان سے آپ ہی ٹکّر لیں گے۔''

اسی وقت لوگوں نے نواب رنگیلے زندہ باد کے نعرے لگا دیے۔ نواب صاحب بھی جوش میں آ گئے۔ کہا، ''اماں، خوں خوار خان کی مجال کہ بچ کے نکل جائے؟ اس کے پیروں میں ہم ایسی قینچی ماریں گے کہ منہ کے بل جا گرے گا۔ لیکن ایک بات ہے۔''

''کیا؟''

''ایسے ٹیڑھے داؤں پیچ آزمانے کے لیے ہمیں تھوڑی طاقت کی ضرورت ہے۔''

''تو؟''

''آپ لوگ مدد کریں تو ہم بھی موٹے ہو سکتے ہیں۔''

چونکہ سوال دیش کی عزّت کا تھا، پنچوں نے طے کیا کہ سارے گاؤں والے باری باری نواب صاحب کو دعوت دیں اور بہترین سے بہترین کھانا کھلائیں۔ چرواہے کو خبردار کیا گیا کہ وہ روزانہ ایک ہنڈا بھر کر دودھ نواب صاحب کے گھر پہنچایا کرے۔

نواب رنگیلے کی تو قسمت کھل گئی۔ مانو وہ سارے گاؤں کے داماد ہوں، ایسے گھر گھر ضیافت اڑانے لگے۔ شیر سنگھ کے وہاں انھوں نے بیسن کے لڈو کی فرمائش کی تو مولوی علی ولی کے گھر سوئیاں کھائیں۔ پنڈت ماکھن لال کے گھر انھوں نے حلوہ پوری پر ہاتھ آزمایا تو طیب علی بوری ے گھر ساری ملائی ہی صاف کردی۔ ''سالا کتنا کھاتا ہے! آدمی ہے کہ ہاتھی!'' بات غلط نہیں تھی۔

نواب رنگیلے کھاتے بھی اتنا تھے کہ میزبان دنگ رہ جاتے۔ مانو سیدھے قحط زدہ علاقے سے آئے ہوں۔ جس گھر میں ان کے قدم پڑتے تھے اس گھر کے لوگ بھوکے ہی رہ جاتے تھے۔ چار پانچ آدمیوں کا کھانا وہ اکیلے ہی اڑا لیتے تھے۔

کچھ ہی دنوں میں نواب رنگیلے گول گپّا ہو گئے۔ اب تو چار لوگ انھیں ڈولی میں اٹھا کر دعوت پر لے جاتے تھے۔ جب ڈولی پنچوں کے گھر کی طرف مڑی تو پنچ کے ممبروں کی آنکھیں چوڑی ہو گئیں۔ مانو ان کا مہمان کوئی آدمی نہیں، گینڈا ہو۔ پھر بھی انھوں نے نواب رنگیلے کا استقبال مسکرا کر کیا۔ چونکہ وہ پنچ تھے، سبھی ممبروں نے مل کر انھیں صرف ایک ہی دعوت دی تھی۔

نواب رنگیلے کو پرواہ نہیں تھی۔ اب بھی ایک گھر بچا تھا۔ وہ تھا کلّو کلہاڑی کا۔ وہ قبرستان کے قریب ہی رہتا تھا۔ جب نواب صاحب کی ڈولی وہاں پہنچی تو ایک قبر کھود رہا تھا۔

''کیوں کوئی مر گیا؟''۔ ڈولی میں سے نکلتے ہوئے انھوں نے پہلا سوال کیا۔

''نہیں۔''

''تب؟''

''کل آپ کشتی لڑنے جائیں گے اور کل ہی مجھے سسرال جانا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''کل کا کام آج کر رہا ہوں۔''

اب نواب رنگیلے کی سمجھ میں آیا کہ قبر کسی مردے کے لیے نہیں بلکہ ان کے لیے تیار کی جا رہی ہے۔ یہ خیال کیا آیا، ان کے بدن کا سارا خون مانو پانی ہو گیا۔ گول پیپے جیسا اپنا بدن انھیں گیس کے غبارے جیسا لگا جو کسی بھی پل

پھٹ سکتا ہے۔

کلو نے کلہاڑی پھینکی اور ہتھیلی سے ہتھیلی مسلتے ہوئے نواب رنگیلے کی طرف دیکھا۔ پھر کہا، ''چلیے نواب صاحب کھانا تیار ہے۔''

''تمھیں کھالو۔'' پسینہ پونچھتے ہوئے وہ بولے۔

''کیوں؟ کیوں؟''

''مرگئی۔''

''نانی؟''

''نہیں، بھوک۔''

''اماں، یہ بھی کوئی بات ہوئی؟'' کلّو کلہاڑی بول اٹھا، ''میں نے تو بیوی سے فرمائش کر آپ کے لیے خاص ملائی کوفتے بنوائے ہیں، ساتھ گاجر کا حلوہ بھی ہے۔''

''نواب رنگیلے نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، ''تب تو سوچنا پڑے گا۔''

آخری دعوت نبٹا کر وہ ڈولی پر سوار ہوئے اور گھر پہنچے۔ لیکن ان کے چہرے پر رونق نہیں تھی۔ مانو ملائی کے نہیں، بھوسے کے کوفتے کھائے ہوں، اور اس کی وجہ تھی۔ ہر ایک لقمے پر انھیں کھدی ہوئی قبر یاد آتی تھی جو وہ قبرستان میں دیکھ آئے تھے۔

گھر میں بھی قبر نے پیچھا نہ چھوڑا۔ رات میں سوئے تو قبر خواب میں آئی۔ چیخ کر وہ بیگم سے لپٹ گئے۔ بیگم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، ''یہ کیا؟''

''کچھ نہیں۔''

''تب آپ مجھ سے ایسے لپٹ کیوں گئے؟''

''یہ تو ہم نیا داؤں آزمارہے تھے۔'' ہوش سنبھالتے ہوئے وہ بولے، ''کل دنگل جو ہے۔''

دوسرے دن صبح سائرن کے ساتھ ہی گاؤں والے نواب رنگیلے کو تیار کرنے آپہنچے۔ شیر سنگھ نے ان کے بدن پر چندن لگایا اور پنچوں کے مکھیا پکار سنگھ نے انھیں دودھ سے نہلایا۔ نواب صاحب کو تو مزہ آگیا۔

پنچایت کے باقی ممبروں نے ان کا گول مٹول بدن پونچھا تو وہ ایسے ہنستے رہے جیسے کوئی انھیں گدگدا رہا ہو۔
پھر مولوی علی ولی نے ان کے بازو پر اما ضامن باندھا اور پنڈت ماکھن لال کی طرف سے ان کی بیوی نے نواب صاحب کی آرتی اتاری۔

اب میدان جنگ میں جانے کے لیے وہ بالکل تیار تھے۔ سر پر انھوں نے لکھنوی ٹوپی پہنی تھی، بدن پر شیروانی اور چست پائجامہ، ہاتھ میں تلوار۔ پیروں میں سلیم شاہی جوتیاں۔

آگے آگے وہ چلے اور پیچھے پیچھے سارا گاؤں۔ اس کوچ کے لیے پنچوں نے آج پڑوس والے گاؤں ڈھول پور سے خاص دو ڈھولی بلوائے تھے۔ نواب رنگیلے کے آس پاس جھومتے ہوئے ڈھول بجاتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہے تھے۔

ہند پاک سرحد دور سے دکھائی دی۔ نواب رنگیلے کی آنکھوں میں قہر ناچ اٹھی۔ ان کے آگے بڑھتے ہوئے پیر دم بھر کے لیے رک گئے۔ پیچھے سے شیر سنگھ نے جو دھکا دیا تو ایک ساتھ پانچ قدم آگے بڑھ گئے۔ پھر رک گئے۔ پھر دھکا کھایا۔ اب کے وہ سات قدم آگے بڑھ گئے۔

''اسے کہتے ہیں اصلی مرد۔'' کسی نے کہا، ''میدان جنگ میں جانے ے لیے ہمارے نواب صاحب کتنے بےتاب ہیں کہ ایک ساتھ پانچ پانچ، چھ چھ قدم بڑھا رہے ہیں۔''

سرحد کے بیچوں بیچ ایک اسٹیج کھڑا کیا گیا تھا۔ یہ اسٹیج بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ بین الاقوامی دنگلوں کے لیے کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس کے چاروں طرف رسّے بھی تھے۔

طبلا گنج کے لوگ پہلے سے ہی آ کر اسٹیج کی طرف منہ کر کے اپنی سرحد میں بیٹھ گئے تھے۔ خوں خوار خان اسٹیج پر مچل رہا تھا۔ گوریلے کی طرح اپنے سینے پر مٹّھیاں مار مار کر چنگھاڑ رہا تھا، ''کہاں ہے رنگیلا پہلوان؟''

نواب رنگیلے نے یہ سنا اور منچ پر چڑھنے کے بجائے وہ تلوار پھینک کر اسٹیج کے نیچے گھس گئے۔ خوں خوار خان سے یہ چھپا نہیں رہا۔ اسٹیج پر وہ اچھل اچھل کر کودنے لگا۔ دھڑام دھڑام سی آوازیں اٹھنے لگیں۔ شیر سنگھ پریشان تھا۔ پنچ پریشان تھے۔ یہ نگاڑا پور کی عزت کا سوال تھا۔

شیر سنگھ نے دونوں ڈھولیوں کو اشارہ کیا۔ گھٹنے کے بل فوراً وہ بھی اندر گھسے اور نواب رنگیلے کے اغل بغل بیٹھ

کر زور زور سے ڈھول پیٹنے لگے۔ اوپر سے دھڑام دھڑام ہورہا تھا۔ نواب رنگیلے گھبرا کر باہر نکل آئے، بالکل اسی طرح جیسے ڈھول نگاڑے کی آواز سے تڑپ کر گھنے جنگل میں چھپا شیر کھلے میں آجاتا ہے۔

شیر سنگھ نے ایک پل بھی کھوئے بغیر انھیں اٹھا کر اسٹیج پر دھکیل دیا۔ حقیقت سامنے آگئی۔ خوں خوار خان سامنے آگیا۔ نواب رنگیلے اوپر سے نیچے تک کانپ اٹھے۔ خوں خوار خان کا چہرہ ہی ایسا ہولناک تھا کہ دن دہاڑے کوئی بچہ اسے دیکھے بے ہوش ہوجائے! پھر بھی۔

نواب رنگیلے نے اپنے ہوش نہ کھوئے۔ ''خوں خوار خان!'' سینہ تان کر وہ بولے، ''کیسی کشتی لڑیں گے؟ بھارتی اسٹائل؟ امریکن اسٹائل؟ جرمن یا جاپانی اسٹائل؟''

''ہم تو صرف ایک ہی کشتی جانتے ہیں!'' خوں خوار خان نے کہا۔

''تب وہیں لڑیں گے۔ کیا نام ہے اس کا؟''

''کمر توڑ، کھوپڑی پھوڑ، گردن مروڑ کشتی!''

''اس میں تو آدمی مر بھی سکتا ہے۔''

''ہاں،'' خوں خوار خان نے بتایا، ''لیکن جو جانتا ہے، وہ زندہ بھی رہتا ہے!''

''ٹھیک ہے۔ تب ہم وہی لڑیں گے،'' نواب رنگیلے نے ایسے کہا جیسے کسی چوہے سے لڑنے جا رہے ہوں، ''لیکن...''

''لیکن کیا؟''

''لڑنے سے پہلے ہم ہنڈیا بھر کر شہد پئیں گے۔''

''تو پی لو۔''

شیر سنگھ نے سر پیٹ لیا۔ نواب رنگیلے نے پھر نئی مصیبت کھڑی کر دی۔ اب ہنڈا بھر کر شہد کہاں سے لایا جائے۔ پنچوں کے مکھیا پکار سنگھ نے فوراً اپنے ساتھیوں کو شہد کی تلاش میں دوڑا دیا۔

دوسری طرف طبلا گنج کے مکھیا دہاڑ علی اپنے ساتھیوں سے کہہ رہے تھے، ''مرنے سے پہلے لوگوں کی خواہشیں عجیب وغریب ہوتی ہیں، نواب صاحب کو شہد یاد آگیا!'' سبھی لوگ کھل کھلا کر ہنس دیے۔ شہد کا ہنڈا اسٹیج پر آگیا۔ شہد

پینا تو دور رہا، نواب رنگیلے ہنڈا ہی نہیں اٹھا سکے۔ وہ جیسے تیسے کوشش کرتے جا رہے تھے، خوں خوار خان کے ساتھ طبلا گنج والے بھی ہنستے جا رہے تھے۔ آخر نواب صاحب نے ہنڈا اٹھا تو لیا لیکن ہونٹوں تک نہ لا سکے۔ ہنڈا ہاتھ سے پھسل گیا۔ سارے اسٹیج پر شہد پھیل گیا۔

''پہلوان رنگیلے!'' خوں خوار خان نے طعنہ کسا، ''چاٹ لو۔''

نواب رنگیلے نے خالی ہنڈا اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا، پھر کہا، ''ہم پیتے ہیں، چاٹو گے تم!''

خوں خوار خان کے سر سے ٹکرا کر ہنڈا اسٹیج کے نیچے جا گرا تھا۔ خوں خوار خان انگارے برسا رہا تھا۔ نواب رنگیلے بھی اپنی شیروانی کی آستین چڑھا رہے تھے، ''میاں پلّے! دیدے کیا دکھا رہے ہو؟ آگے بڑھو! ہم تیار ہیں۔''

خوں خوار خان کو ایسا غصّہ آیا کہ وہ اپنی جگہ سے بیل کی طرح اچھلا اور جیسے ہی آگے بڑھا کہ فرش پر پھیلے شہد کی چکناہٹ کی وجہ سے اس کا پیر پھسل گیا۔ دھڑام سے وہ گرا اور وہ بھی منہ کے بل۔

اب ہنسنے کی باری نگاڑاپور والوں کی تھی۔ وہ سبھی کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

''بھائی چینٹے!'' نواب رنگیلے اپنے دشمن کو للکار رہے تھے، ''شہد بہت چاٹا! اب تو کھڑے ہو جاؤ!''

خوں خوار خان تڑپ کر پھر کھڑا ہوا، پھر پھسلا۔ پھر گرا۔ نگاڑاپور کے لوگ اب پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے۔ کچھ لوگ تو ہنستے ہنستے لوٹ بھی رہے تھے۔

نواب رنگیلے اپنی جگہ ڈٹ کر کھڑے تھے۔ وہ جانتے تھے، اس اسٹیج پر ڈگ بھرنا خطرے سے خالی نہیں۔ خوں خوار خان اب تیسری بار اٹھنے لگا اور تیسری بار پھسلا تو نواب رنگیلے کود کر اس کی پیٹھ پر کھڑے ہو گئے۔

نگاڑاپور کے لوگوں نے ایسے زور سے کلکاری ماری کہ آسمان گونج اٹھا۔ نواب صاحب اب بندر کی طرح اچھل اچھل کر خوں خوار خان کا کچومر بنا رہے تھے۔ خوں خوار خان اوندھا پڑا تھا اسٹیج پر ہاتھ پچھاڑ رہا تھا۔ آخر وہ ہاتھ بھی خاموش ہو گئے۔ نگاڑاپور کے لوگ بھی ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔

شیر سنگھ نے کہا، ''رنگیلا پہلوان!''

لوگوں نے کہا، ''زندہ باد!''

''نگاڑاپور کی...!''

''جے...!''

طبلا گنج کے لوگ من ہی من ماتم کرتے ہوئے، سر جھکائے لوٹ گئے، لیکن نگاڑاپور کے لوگ نواب رنگیلے کو کندھوں پر اٹھائے جھومتے رہے۔ نعرے بازی کرتے ہوئے دیر تک گاؤں میں گھومتے رہے۔ نگاڑاپور والوں کی جیت کے باوجود طبلا گنج پاکستان میں ہی رہا اور اس کی بھی وجہ تھی۔

جب دوسرے دن طبلا گنج کا مکھیا دہاڑعلی نواب رنگیلے کے گھر آیا تب پنچ بھی وہاں حاضر تھے۔ وہ مشورہ کر چکے تھے۔ نواب رنگیلے نے بتا دیا، ''میاں دہاڑعلی! تقسیم کے وقت جو فیصلہ بزرگوں نے کیا، اس میں دخل دینے کا اب نہ تمھیں حق ہے، نہ ہمیں۔ اور یہ بھی یاد رہے، پھر کبھی نگاڑاپور کو ہڑپنے کا خواب دیکھا تو طبلا گنج کے طبلے بجانے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ سمجھے!''

دہاڑعلی سمجھدار تھا۔

سمجھ گیا۔
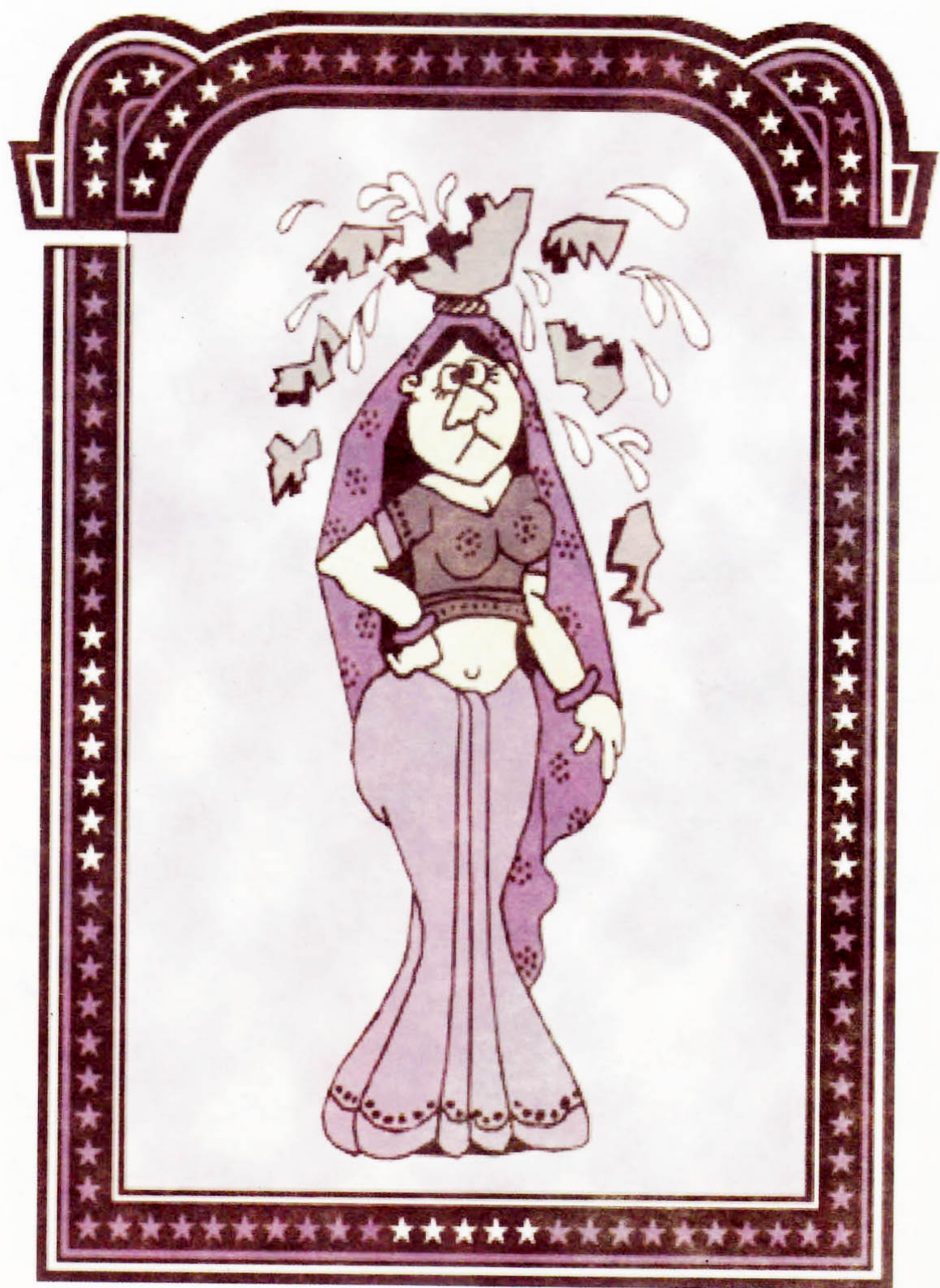
جوان ننّا نوے سال کا

ابھی کچھ ہی دنوں پہلے کی بات ہے۔ تب نگاڑا پور کے لوگ ڈاکو بھوت ناتھ سے پریشان تھے۔ نواب رنگیلے نے اپنی ہمت اور زندہ دلی کا ثبوت دے کر ڈاکو بھوت ناتھ کا بھرتا بنایا تو لوگوں نے چھٹکارے کی سانس لی۔ لیکن یہ چین کچھ زیادہ دیر پا نہ رہا، بلکہ ایک نئی مصیبت آن کھڑی ہوئی۔

بات دراصل یہ تھی کہ ننا نوے سال کا بوڑھا جوان بن گیا تھا۔ وہ کمبخت جوان کیا بنا، سارا گاؤں توبہ توبہ پکار اٹھا۔ لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے جا کر کچھ کہے۔ ویسے پچھلے ہفتے کلّو کلہاڑی نے کچھ کہنے کی جرأت ضرور کی تھی۔

تب کلو کلہاڑی ایک قبر کھودرہا تھا اور ننا نوے سال کا بوڑھا غلیل لے کر قبرستان میں آ پہنچا۔ بڑے سے گڈھے کو غور سے دیکھ کر اس نے پوچھا، ''میاں کلو، کسے لٹانے کی تیاری ہورہی ہے؟''

''چاچا، آپ کو!'' کلو نے مذاق میں کہا اور ننا نوے سال کے بوڑھے نے جیمس بانڈ کی طرح اچھل کر اسے ایک ایسا کرارا چانپ مارا کہ کلو خود ہی لڑھک کر اپنی کلہاڑی کے ساتھ اسی قبر میں لیٹ گیا۔ جب اس کی آنکھیں کھلیں تو پورے پانچ گھنٹے بیت چکے تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور قبر سے نکل کر پنچوں کے مکھیا کے گھر کی طرف چل پڑا۔

ننا نوے سال کے بوڑھے کی حرکتوں سے صرف مرد ہی پریشان نہیں تھے، عورتیں بھی تنگ آ چکی تھیں۔ اس کے غلیل کے نشانے کے ڈر سے پنہاریوں نے تالاب پر جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اب ساری عورتیں پانی بھرنے اور کپڑے دھونے مغرب کے کنوئیں پر جایا کرتی تھیں۔

ننا نوے سال کا بوڑھا آج وہیں آ دھمکا۔ ایک اونچا تناور درخت چنا اور دندناتا ہوا اوپر چڑھ گیا۔

پھر ایک کے بعد ایک نشانے لینے لگا۔ جو بھی لڑکی پانی بھر کر آگے بڑھتی اس کی گگری بوڑھے کا نشانہ بنتی اور ٹکڑوں میں بنٹ جاتی۔ پانی بہہ جاتا۔

آخر میں مکھیا کی بیٹی چندا سر پر گاگر رکھ کر ہمت سے آگے بڑھی۔ وہ بالکل اُسی گھنے درخت کے نیچے سے گزری جس کی ٹہنیوں میں ننانوے سال کا کھوسٹ چھپ کر بیٹھا تھا۔ وہ جلدی جلدی آگے بڑھ رہی تھی۔ دل دھڑک رہا تھا - ابھی کنکر آیا اور ابھی گاگر پھوٹی۔

خیر، کنکر تو نہیں آیا، بوڑھا خود پیڑ سے کود کر اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ یہی نہیں، اس کی کلائی تھام کر کسی ہٹ فلم کا ہٹ گیت بھی گانا شروع کر دیا - پیار کیا تو ڈرنا کیا...

چندا کو ایسا غصّہ آیا کہ اس نے اپنے سر پر کی گاگر اس کے سر پر دے ماری۔ لیکن بوڑھے کا سر تھا یا پتھر، خدا جانے! گاگر پھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ بوڑھا پانی پانی ہوگیا۔ پھر بھی اس نے کلائی نہیں چھوڑی، نہ گیت بند کیا - پیار کیا کوئی چوری نہیں کی، چھپ چھپ آہیں بھرنا کیا...

چندا بوکھلا گئی۔ کچھ نہ سوجھا تو وہ بیل کی طرح اچھلی اور جس طرح بیل سینگ مارتے ہیں ویسے ہی اس نے سر دے مارا۔ ننانوے سال کا بوڑھا دو قدم پیچھے کھسک گیا۔ کلائی چھوٹ گئی۔ چندا ایسی بھاگی کہ مڑ کر دیکھا تک نہیں۔

''آخر اس بوڑھے کو ہو کیا گیا ہے؟'' کلّو کلہاڑی کی بات سن کر مکھیا بول اٹھا، ''جسے دیکھو اسے کراٹے چانپ مارتا پھرتا ہے۔ تھانے دار بندوقی لال کو اس نے ایسا چانپ مارا کہ بے چارے نے کھٹیا ہی پکڑ لی۔''

وہ کچھ آگے کہے اس سے پہلے چندا نظر آ گئی۔ مکھیا نے جب اس کی داستان سنی تو وہ بھنّا اٹھا۔ ''کیا!'' وہ دہاڑا، ''مٹکی پھوڑتے پھوڑتے پٹھا اب لڑکیوں کی کلائیاں بھی موڑنے لگا ہے؟ اس کی یہ مجال کہ میری اپنی ہی بیٹی پر ڈورے ڈالے!''

مکھیا کو غصّہ تو بہت آیا لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ بزرگوں کی جگہ تو دل میں ہوتی ہے۔ دل میں نہ سہی سر آنکھوں پر تو ہوتی ہی ہے اور ایک یہ ننانوے سال کا کھوسٹ تھا جو سر پر چڑھا آ رہا تھا۔

وہ کچھ آگے سوچے اس سے پہلے چندا نے جوڑا،''باپو یہ نگوڑا کہہ رہا تھا کہ لڑکیوں سے چھیڑ خانی کرنا اس کا حق ہے۔''

''اُس بے حیا، بدتمیز، پاجی کو یہ حق دیا کس نے؟'' مکھیا پھر ایک بار آپے سے باہر ہوگیا۔

''یہ میں بتاؤں گا۔'' پنڈت ماکھن لال نے داخل ہوتے ہوئے کہا،''بوڑھے کی جوانی سے مجھے سیاست کی بُو آرہی ہے!''

''سیاست!'' مکھیا اس کی طرف مڑا۔

''اور کیا؟ چناؤ کے دن قریب آرہے ہیں۔''

''لیکن چناؤ کے ساتھ گگری پھوڑنے کا کیا تعلق ہوسکتا ہے؟''

''یہ آپ نہیں سمجھیں گے۔''

''کیوں؟ کیا ہمارے دماغ میں کائی لگی ہوئی ہے؟''

''مولوی علی ولی کی یہ گہری چال ہے!'' پنڈت نے سنجیدگی بنائے رکھتے ہوئے بتایا،'' کامیاب بھی ہے۔ لیکن میں اسے کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔''

''کیسی چال؟ کاہے کی چال؟'' اب مکھیا کی حیرانی بڑھی۔

''مولوی کے گروہ والے ہماری لڑکیوں پر دباؤ ڈال کر ہمارے سارے ووٹ ہتھیانا چاہتے ہیں۔'' کہتے ہوئے پنڈت جی نے تھوڑی سی مٹّی اٹھائی اور آگے کہا،''قسم نگاڑاپور کی دھرتی ماتا کی، ہنومان اکھاڑے کے سارے پہلوانوں کو کتّے کی طرح اس کے پیچھے چھوڑ کر اس کی ٹانگ نہ تڑوادی تو میرا نام پنڈت ماکھن لال نہیں۔''

مولوی صاحب کو اس بات کا پتہ چلا تو پہلے وہ داڑھی اور مونچھ کے بیچ مسکرائے۔ پھر اپنے گروہ والوں سے کہا،''اگر یہ بات سچ ہے کہ ننانوے سال کا بوڑھا ہمارے گروہ کے لیے کام کر رہا ہے تو اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔''

کچھ لڑکے وہاں کھڑے تھے۔ انھوں نے جوش میں آکر زوردار نعرہ لگادیا،''مولوی صاحب۔

زندہ باد۔''

''قسم نگاڑاپور کی دھرتی ماتا کی۔'' لڑکوں کو اشارے سے روکتے ہوئے انھوں نے چٹکی بھر ماٹی اٹھائی، ''اگر ہمارے گروہ کے ایک بھی رکن کی ایک بھی ٹانگ ٹوٹی تو دشمنوں کی ہم سَو ٹانگیں توڑ کر دم لیں گے۔''

مولوی صاحب نے کرتے پر کالا کوٹ ڈالا، سر پر ٹوپی رکھی اور چھڑی پر پنجا جماتے ہوئے غضب علی کے اکھاڑے کی طرف چل دیے۔

سیاست کا پہلا اور آخری سبق مولوی صاحب گھول کر پی گئے تھے اور وہ تھا، ''تقریر کرنا لیڈروں کا کام ہے، خون بہانا ارکان کا۔'' اور غضب علی کے اکھاڑے کے سبھی پہلوان مولوی صاحب کی پارٹی کے ارکان تھے۔

مولوی صاحب اکھاڑے میں پہنچے تو ان کے پاؤں آنگن میں ہی ٹھہر گئے۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ سر کے بال کھڑے تو کیا ہوئے، ٹوپی بھی کھڑی ہوگئی۔ جو کچھ نظارہ اُن کے سامنے تھا، جو کچھ ان کی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ رہی تھیں، انھیں یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔

پہلوان غضب علی چت پڑا تھا۔ دوسرے دو پہلوان دھول پھانکتے ہوئے مٹّی میں اوندھے نظر آ رہے تھے تو تیسرا اپنی ٹانگ پکڑ گلا پھاڑ کر رو رہا تھا۔ چوتھا ایک کونے میں کھڑا کھڑا ابھی بھی کانپ رہا تھا۔ مانو جنّ اسے سے گلے مل کر چلتا بنا ہو!

مولوی صاحب کچھ سوچتے ہوئے اس کے قریب آئے اور اس کے کندھے پر محبت سے ہاتھ رکھا۔ وہ اچانک چیخ اٹھا، ''بچاؤ! بچاؤ!'' مولوی صاحب ڈر کر دو قدم پیچھے کھسک گئے۔

آخر معاملہ کیا ہے؟ یہ ان کی سمجھ میں اب بھی نہیں آ رہا تھا۔ جب غضب علی پہلوان بیٹھا ہوا اور سر جھاڑ کر مولوی صاحب کی طرف دیکھا تو مولوی صاحب اس کی جانب آگے بڑھ گئے۔

''اماں، بات کیا ہے؟''

غضب علی چپ چاپ ان کی طرف دیکھتا رہا۔

''کیا کوئی پاگل ہاتھی اکھاڑے میں گھس آیا تھا؟''

غضب علی نے اشارے میں ''نہ'' کہا۔

''تو کیا ہنومان اکھاڑے کے پہلوانوں نے دھاوا بول دیا؟''

''آپ بھی کیسی بے تکی باتیں کرتے ہیں۔'' غضب علی نے کھڑے ہوتے ہونٹ کھولے، ''ان کھٹملوں کی مجال کہ اس طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھیں؟''

''تب معاملہ کیا ہے؟''

ایک پہلوان جو ٹانگ پکڑ کر روئے جا رہا تھا، اور زور سے رونے لگا۔

'' کچھ سمجھ میں نہیں آتا، مولانا!'' غضب علی کہہ رہا تھا، ''ایسا کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟''

''لیکن ہوا کیا؟''

''ننانوے سال کے بڈّھے نے ہم سب کو پیٹ ڈالا۔''

''ایں! کیا کہا؟''

''وہی، جو آپ نے سنا۔''

''ننانوے سال کے بڈّھے نے تم سب کی دھنائی کر ڈالی؟''

''بالکل۔''

''لاحول ولاقوۃ...!''

سبھی پہلوانوں پر لعنت برساتے ہوئے انھوں نے تھوک دیا۔

''تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو نا؟'' مانو اب بھی انھیں یقین نہ ہو۔

''یقین تو مجھے بھی نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن ہے سچ۔'' کہتے ہوئے غضب علی نے سارا قصّہ مرحلے وار بتایا۔

روز کی طرح آج صبح بھی پہلوانوں نے ہزار ہزار بیٹھکیں ماری اور ڈنڈ پیلے۔ پھر ناشتے کے لیے بیٹھے۔ ناشتے میں آج پراٹھے اور ربڑی تھی۔ صبح چھ بجے حلوائی ربڑی کی مٹکی چھوڑ گیا تھا۔ لیکن ٹھیک ناشتے

کے وقت ہی مٹکی غائب ہوگئی۔

''ابھی ابھی تو یہاں تھی۔'' ایک پہلوان نے کہا۔

''تب گئی کہاں؟'' غضب علی نے چور کی داڑھی میں تنکا ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہوئے سبھی پہلوانوں پر باری باری نظر ڈالی۔ ''کیا نگاڑاپور میں کوئی ربڑی چور پیدا ہوگیا؟'' اس کا یہ کہنا تھا کہ تڑاخ سے خالی مٹکی اس کے سر پر پڑی اور تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔

سبھی نے نظریں اٹھائیں تو کیا دیکھا کہ ننانوے سال کا بوڑھا ربڑی والی انگلیاں چاٹتا ہوا اموا کی پکی ڈالی پر اطمینان سے بیٹھا تھا۔ غضب علی پہلوان کو ایسا غصّہ آیا، ایسا غصّہ آیا کہ اس نے پیڑ کو اپنے دو ہاتھوں میں پکڑ کر ہلا ڈالا۔

پھر کیا؟ ننانوے سال کا بوڑھا پکے آم کی طرح نیچے دھنس آیا۔ پانچوں پہلوان اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس وقت مارے بھوک اور غصّے کے وہ بھول گئے تھے کہ بوڑھے آخر بوڑھے ہوتے ہیں اور پہلوان آخر پہلوان ہوتے ہیں۔

لیکن جیسے ہی وہ ننانوے سال کے بوڑھے پر لپکے کہ انھیں احساس ہوا، وہ کسی بم پر گرے ہیں اور بم پھٹنے پر جیسے قریب کے انسانوں کی چندھیاں اڑتی ہیں، ویسے ہی پانچوں پہلوان اچھلے اور ادھر ادھر جا گرے۔ حقیقت میں ننانوے سال کے بوڑھے نے لیٹے لیٹے صرف اپنے ہاتھ پیر ہی ہلائے تھے۔

پہلوان لوگ ہوش سنبھالیں اس سے پہلے ننانوے سال کا بوڑھا اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہوگیا، اور پھر ایک ایک پہلوان کی ہڈّی پسلی بجادی۔ ایک کی تو ٹانگ ہی توڑ دی۔

''ماشاء اللہ...'' مولوی صاحب نے اپنی ٹوپی کے اندر انگلیاں سرکاتے ہوئے سر کھجلایا۔ پھر پوچھا، ''لیکن اس پٹّھے میں اتنی طاقت آئی کہاں سے؟''

''یہی تو ہماری بھی سمجھ میں نہیں آرہا۔''

''جس روز یہ راز تمھاری کھوپڑی میں آجائے گا، اسی دن چناؤ میں ہماری پارٹی کی جیت طے ہوجائے گی۔'' کہتے ہوئے مولوی صاحب نے حکم چھوڑا، ''جاؤ کسی بھی قیمت پر بوڑھے کو ڈھونڈ لاؤ!''

غضب علی سوچ میں پڑ گیا۔ سوال پہلا، ننانوے سال کے بوڑھے کو ڈھونڈھا کیسے جائے؟ سوال دوسرا، اگر مل جائے تو اسے یہاں تک لایا کیسے جائے؟ سوال تیسرا، غلطی سے اگر آ بھی جائے تو اس سے اس کی طاقت کا راز معلوم کیسے کیا جائے؟

آخر میں غضب علی پہلوان اس نتیجے پر پہنچا کہ سب سے پہلے سوال نمبر ون حل کیا جائے۔ اور جب تک پہلا سوال حل نہیں ہوتا دوسرے اور تیسرے کے بارے میں سوچنا بے وقوفی ہوگی۔

آملیٹ اور پراٹھے کا ناشتہ نپٹا کر غضب علی پہلوان اپنے چیلوں کے ساتھ ننانوے سال کے بوڑھے کی تلاش میں نکل پڑا۔ بوڑھے کو تلاش کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگر بوڑھے کی طاقت کا راز اسے پتہ چل جائے تو غضب علی 'نگاڑاپوری' سے غضب علی 'وشوپوری' بن جائے۔

گلی محلے سے آگے بڑھتے ہوئے غضب علی اور اس کے پہلوان چوراہے تک آئے اور رُک گئے۔ چوراہے پر شاید ابھی ابھی بجلی گری تھی۔ ہنومان اکھاڑے کی سبھی پہلوان اوندھے منہ دھول میں پڑے تھے۔ کوئی کراہ رہا تھا، کوئی رو رہا تھا، کوئی بجرنگ کو یاد کر رہا تھا تو کوئی صرف آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اماں، کیا ہوا؟'' غضب علی پہلوان نے پوچھا تو ہنومان اکھاڑے کا گرو، پہلوان پکوڑی مل اس کا چہرہ تاکنے لگا۔ اب وہ کس منہ سے کہے کہ پنڈت ماکھن لال کا حکم پا کر وہ لوگ ننانوے سال کے بوڑھے کی ٹانگ توڑنے نکلے تھے اور بوڑھے نے ان سب کا آملیٹ بنا کر رکھ دیا۔

''اماں، کچھ تو بتاؤ!''

''کیا بولوں؟''

''آپ لوگوں کی مٹّی پلیت کس نے کی؟''

''وہ بتلانے سے بہتر یہی ہوگا کہ چلّو بھر پانی میں ڈوب مروں۔''

''کہیں یہ کرامت ننانوے سال کے جوان کی تو نہیں!''

''ایں!'' اب پکوڑی مل پہلوان چونکا، ''تمھیں کیسے پتہ چلا؟''

''شروعات اس نے ہمارا بھرتہ بنانے سے کی تھی۔''

''کیا کہتے ہو!''

''اور اس وقت ہم اسی کی تلاش میں نکلے ہیں۔''

پکوڑی مل پہلوان سوچ میں پڑ گیا۔ پھر پوچھا، ''اسے تلاش کر کے تم کیا کرو گے؟''

غضب علی پہلوان وجہ بتانے جا ہی رہا تھا کہ اس کے ساتھی نے اسے روک لیا۔

غضب علی پہلوان نے اصلی وجہ گول کرتے ہوئے بتایا، ''مذاق تھوڑے ہی ہے۔ ناک کٹی ہے، ہم سب کی۔ جب تک اسے چت نہیں کریں گے، چین نہیں پڑے گا۔''

''اگر یہی بات ہے تو ہم پیچھے نہیں رہ سکتے۔'' پکوڑی مل پہلوان سینہ پھیلاتے ہوئے دہاڑا۔

''تم کیا کرو گے؟''

''چونکہ اصل مشورہ تمھارا ہے اس لیے پہلے تم اسے چت کرو گے اور بعد میں ہم،'' کہتے ہوئے اس نے جوڑا، ''آخر بدلہ تو ہمیں بھی لینا ہے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' غضب علی پہلوان نے پکوڑی مل پہلوان کی چال سونگھ لیتے ہوئے پوچھا، ''لیکن سوال یہ ہے کہ اسے ڈھونڈھا کہاں جائے؟''

''بلکہ سوال یہ ہے کہ اس میں اتنی طاقت آئی کیسے؟''

یہ پوچھتے ہی پکوڑی مل پہلوان کے دماغ میں بجلی کوندی۔ اس نے سوچا، اگر اس راز کا پتہ چل جائے تو مجال ہے کسی کی کہ پنڈت ماکھن لال کا مقابلہ کر سکے! اب کی چناؤ میں طاقت سے طاقت ٹکرانے والی ہے، طاقت کی جیت تھی۔

اب غضب علی پہلوان نے بھانپ لیا کہ پکوڑی مل پہلوان نے بھی بھانپ لیا ہے تو اس نے بات صاف کر دی، ''دیکھو بھیا، بوڑھے کا راز جاننے کے لیے اسے گرفتار کرنا ضروری ہے۔ اگر تم اسے چت کر دو تو راج تمھارا اور ہم کر دیں تو ہمارا، ٹھیک؟''

''بالکل ٹھیک۔''

دونوں پہلوانوں نے ہاتھ ملائے۔

تبھی وہاں سے نواب رنگیلے گزرے، ''اماں یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟ کیا اب نگاڑاپور میں دو اکھاڑے نہیں رہے؟ دونوں ایک ہو گئے کیا؟''

''ایسا ہی سمجھو۔'' غضب علی پہلوان بولا۔

''یہ تو منہ میٹھا کرنے والی بات ہے۔ اماں، کچھ پیڑے بانٹو۔''

''پیڑے تب بٹیں گے میاں، جب بڈھا ہاتھ آ جائے گا'' اب کی جواب پکوڑی پہلوان نے دیا، ''اور پیڑے وہ بانٹیں گے جس کے پنجے میں بزرگ کی گردن پھنسے گی۔''

نواب صاحب کو حیرانی ہوئی، ''ایسی کیا گستاخی کی اس بزرگ نے؟''

''کس نیند سے جاگے ہیں، آپ؟'' غضب علی پہلوان نے بات کی ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی، ''کیا آپ کچھ نہیں جانتے؟''

''نہ۔''

تو جان لو کہ ننانوے سال کا بوڑھا اب بوڑھا نہیں رہا۔''

''کیا کہتے ہو!'' نواب رنگیلے بول اٹھے، ''کیا وہ جوان بن گیا ہے؟''

''جوان بھی کیسا؟ دونوں اکھاڑے کے سبھی پہلوانوں کی اس نے ہڈی سے ہڈی اور پسلی سے پسلی بجا دی۔''

''یا اللہ! اب تو وہ بوٹی کام کر گئی۔''

نواب رنگیلے کا یہ کہنا تھا کہ سبھی پہلوانوں کے کان کھڑے ہو گئے۔

''کون سی بوٹی؟'' پکوڑی مل پہلوان بول اٹھا، ''کیا آپ اس بارے میں کچھ جانتے ہیں؟''

''کیوں نہیں؟ کل شام ہم نے ہی تو اسے دی تھی۔''

''ایں...'' کہتے ہوئے غضب علی پہلوان نے اس کا ایک پیر تھام لیا۔

''ایں...'' منہ پھاڑتے ہوئے پکوڑی مل پہلوان نے اس کا دوسرا پیر پکڑ لیا۔

کراماتی جڑی بوٹی کے لیے دونوں ہی پہلوان ان سے منتیں کرنے لگیں۔ بڑے بڑے لالچ دینے

لگے۔

''میں... میں اپنے اکھاڑے میں آپ کا بُت کھڑا کر دوں گا،'' غضب علی پہلوان کہہ رہا تھا، ''سنگ مرمر کا۔''

''میں... میں اپنے ہنومان اکھاڑے کا نام بدل دوں گا،'' پکوڑی مل پہلوان گڑگڑا رہا تھا، ''کل سے وہ... نواب جنگ بہادر اکھاڑا کہلائے گا۔''

نواب صاحب کو ایسی میٹھی میٹھی باتیں سننے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ کیسے نہ آئے؟ انھوں نے کہا، ''بولو بولو! بولتے جاؤ، رُک کیوں گئے؟''

اب کی غضب علی نے دانت کٹکٹا کر کہا، ''اگر مجھے راز نہیں بتایا تو میں آپ کی ایک ٹانگ کھینچ لوں گا۔''

''اور مجھے نہیں بتایا،'' پکوڑی پہلوان کا چہرہ بھی سخت ہوگیا، ''تو میں آپ کی یہ دوسری ٹانگ کھینچ لوں گا۔''

پھر دونوں پہلوان کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے اپنے اپنے پنجے نواب رنگیلے کی گردن پر جما دیے۔ نواب صاحب کی سانس رکنے لگی، ''ٹھہرو!'' پھر بھی وہ بولے، ''میری ایک شرط ہے۔''

دونوں پہلوانوں نے گردن چھوڑ دی۔ پھر پوچھا، ''کہو، شرط کیا ہے؟''

''دراصل بات یہ ہے کہ...'' نواب صاحب نے اپنی گردن پر نزاکت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بتایا، ''ہمیں راز کسی ایک کو بتانا ہے اور آپ دو ہیں۔ اس لیے ہماری آپ دونوں سے یہ گزارش ہے کہ آپ دونوں کشتی لڑیں اور جو جیتے اسے ہم راز بتا دیں۔ کہو، کیا خیال ہے؟''

''مجھے منظور ہے۔'' غضب علی نے کہا۔

''مجھے منظور ہے۔'' پکوڑی مل پہلوان نے کہا۔

آؤ دیکھا نہ تاؤ، اور دونوں پہلوان پاگل ہاتھیوں کی طرح ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ نواب صاحب کو اسی موقع کا انتظار تھا۔ جیسے ہی دونوں پہلوان کشتم کشتا ہوئے کہ وہ کھسک لیے۔

یہاں دونوں اکھاڑوں کے پہلوان اپنے اپنے گرو کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا، گرو قینچی مارو! تو کوئی کہہ رہا تھا، گرو اینٹ کا جواب پتھر سے دو۔ تبھی دونوں گروؤں کو خیال آیا۔ نواب رنگیلے ندارد ہیں۔

دوسرے ہی پل دونوں پہلوانوں کی سمجھ میں نواب رنگیلے کی چال آ گئی۔ اُن دونوں کو لڑا کر نواب صاحب چلتے بنے تھے۔ دونوں گروؤں نے پھر ہاتھ بڑھایا اور یہ ہاتھ دوستی کا تھا۔ دونوں دل پھر ایک ہو گئے اور نواب صاحب کا کچومر بنانے، ان کی تلاش میں چل دیے۔

نواب صاحب نے مڑ کر دیکھا تو چکرا گئے۔ پہلوانوں کی آندھی طوفان کی طرح پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ نواب صاحب نے رفتار اور تیز کی لیکن کہاں پہلوانوں کی دوڑ اور کہاں رنگیلے نواب کی؟ نواب صاحب کو دوڑتے دوڑتے اپنی نانی یاد آ گئی۔ پھر نانا یاد آئے۔ پھر سارے جنت نشین بزرگ یاد آئے جو ان کے اپنے خاندان کے تھے۔

وہ رُک گئے۔ آنکھیں بند کر لیں اور آخری بار اللہ کو یاد کرنے کے لیے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے۔ اس کے بعد کیا ہوا، اس کا نواب صاحب کو پتہ نہیں۔ دعا کے اٹھے ہوئے ہاتھ جب نیچے ہوئے اور آنکھ کھلی تو انھوں نے کرامت دیکھی۔ سارے پہلوانوں نے پیٹھ دکھا دی تھی۔ دُم دبا کر وہ بھاگے جا رہے تھے۔

اب نواب صاحب کیا جانیں کہ پہلوانوں نے کچھ ہی فاصلے پر ننانوے سال کے بوڑھے کی صورت دیکھی تھی اور ڈر کے مارے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ تو سمجھے کہ انھوں نے اللہ کو یاد کیا اور نتیجہ سامنے آ گیا۔ دشمنوں کا حوصلہ پست ہو گیا۔

بس، پھر کیا، نواب صاحب نے آستین چڑھائی اور پہلوانوں کے پیچھے چلاتے ہوئے دوڑے، "آ جاؤ! سب کا کچومر بنا دوں گا!"

پہلوانوں کے پیچھے کافی دور جا کر جب نواب صاحب لوٹے تو راستے میں انھیں پانچ اندھوں کی طرح قدم بڑھاتے ہوئے پنچایت کے ممبر ملے۔ انھوں نے ابھی ابھی نواب صاحب کا نیا حوصلہ دیکھا تھا

اور دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ نگاڑا پور کی تاریخ میں کسی نے سارے کے سارے پہلوانوں کو ایک ساتھ چیلنج دے کر کھدیڑا ہو ایسا کسی کو یاد نہیں تھا۔

سب سے پہلے مکھیا نے نواب صاحب کو ان کی فتح کے لیے مبارک باد دی، پھر کہا، ''اس بات میں کوئی شک نہیں کہ نگاڑا پور میں صرف ایک ہی مرد ہے۔''

''سو تو ہم ہیں ہی۔'' انھوں نے سینہ چوڑا کرتے ہوئے سینہ ٹھونکا۔

''اور ننانوے سال کے بوڑھے کو گرفتار کرنے کی ذمہ داری ہم لوگ آپ کو سونپتے ہیں۔''

''ایں...!'' نواب صاحب کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔

''کیا... تھانے دار بندوقی لال نے استعفیٰ دے دیا؟''

''نہیں۔'' مکھیا نے بتایا، ''اس نے گھر کی کھٹیا چھوڑ اسپتال کی چارپائی پکڑ لی ہے۔''

''لیکن آپ لوگوں کو پتہ ہونا چاہیے کہ ہم شیر ہیں، گیدڑوں سے نہیں الجھتے۔''

''سچ!'' مکھیا نے دلیل پیش کی، ''لیکن اس گیدڑ سے آپ کو الجھنا پڑے گا کیونکہ اسے آپ ہی نے شیر بنایا ہے۔''

''ہاں ہاں،'' پنچ کا دوسرا ممبر بیچ میں بول اٹھا، ''اسے آپ نے بوٹی دی تھی۔ آپ کی وجہ سے یہ مصیبت کھڑی ہوئی ہے۔ اسے آپ ہی کو سلجھانا ہوگا - اگر آپ جنگ بہادر ہیں تو۔''

سوال عزت کا آن پڑا۔ نواب کو چیلنج قبول کرنا پڑا۔ ''ٹھیک ہے،'' وہ بولے، ''چوبیس گھنٹوں میں بوڑھا ہمارے قدموں میں لیٹتا ہوا دکھائی نہ دیا تو ہم بھی مردِ میداں نہیں۔'' یہ سننا تھا کہ پنچ تالیاں بجا اٹھے۔

پنچوں سے وداع لے کر نواب صاحب گھر کی جانب چلے تو حقیقت سامنے آ گئی۔ جس کھوسٹ نے نگاڑا پور کے دونوں اکھاڑوں کے سبھی پہلوانوں کو دھول چٹائی تھی اسی کو گرفتار کرنا تھا۔

نواب صاحب کے پیر راستے میں ہی ڈگمگانے لگے۔ انھوں نے سوچا، کہیں بوڑھے کو پتہ چل گیا کہ اسے گرفتار کرنے کا بیڑا انھوں نے اٹھایا ہے تو بوڑھا ان کی ہی چمڑی ادھیڑ لے گا۔ لیکن اب ہو بھی

کیا سکتا ہے؟ سوائے اس کے کہ گھر پہنچ کر چار پائی کے نیچے پناہ لی جائے۔

آخری مشورے پر انھوں نے برابر عمل کیا۔ وہ گھر پہنچے اور سیدھے چار پائی کے نیچے چھپ کر لیٹ گئے۔ بیگم رنگیلی حیرانی سے دیکھتی رہی۔ وہ کچھ سوچے، کچھ کہے، اس سے پہلے نواب صاحب نے کہہ دیا، ''سنتی ہو!''

''دیکھتی بھی ہوں!''

''اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مت دیکھو،'' نواب صاحب نے جھلّا کر کہا، ''سنو! آج سے ہم نگاڑ اپور میں نہیں ہیں۔''

''ایں... اب کہاں ہو؟''

''سمجھ لو، ہم کشمیر میں ہیں۔''

بیگم کو مزہ آیا، ''لیکن آپ تو یہیں ہیں۔''

''عقل کی دُم! ہم نے کب کہا کہ ہم نگاڑ اپور میں نہیں ہیں۔''

''تب؟''

''سمجھ لو۔''

''کیا سمجھ لوں؟''

''یہی کہ ہم کشمیر میں ہیں۔''

''سمجھ لیا۔ اب؟''

''کوئی بلاوا آئے تو کہہ دینا کہ ہم یہاں نہیں ہیں۔ صحیح؟''

''بالکل صحیح۔''

''اب بتاؤ کہ آج کیا پکا ہے؟''

''بیسن کے لڈّو۔'' بیگم نے بتایا، ''اور وہ بھی اصلی گھی کے۔''

''دو چار ہمیں بھی دے دو، بیگم!''

''آپ کو کیسے دے سکتی ہوں؟'' وہ بول اٹھی، ''آپ تو کشمیر میں ہیں۔''

''ایں...'' نواب صاحب کا چہرہ چوڑا ہو گیا۔

تبھی شیر سنگھ نے باہر سے آواز دی، ''اماں، نواب صاحب! گھر پر ہیں کیا؟''

نواب رنگیلے چار پائی کے نیچے تھوڑی اور چھپ گئے۔ جواب بیگم نے ہی دیا، ''وہ تو یہاں نہیں ہیں۔''

''کہاں گئے ہیں؟''

''کشمیر۔''

''سچ؟''

''ایک دم سچ۔''

''پھر مجھے کیوں یقین نہیں ہو رہا؟''

''تب اندر آ کر پوچھ لو انھیں سے۔'' بیگم نے چڑھ کر کہا۔

نواب صاحب نے سر پیٹ لیا۔ آہستہ آہستہ وہ چار پائی کے نیچے سے باہر نکلے تو شیر سنگھ نے اندر آتے ہوئے کہا، ''لو، آپ تو یہیں ہیں۔''

''تم نے آواز جو دی۔'' نواب صاحب نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، ''ہم خیالی کشمیر سے کود کر حقیقی نگاڑا پور میں آ دھمکے! کہو، کیسے آنا ہوا؟''

''ننانوے سال کے بوڑھے کے بارے میں کچھ سوچا؟''

''اماں، گیدڑ کے بارے میں شیر تھوڑے ہی سوچتا ہے!''

''سچ، لیکن اب سوچنا پڑے گا۔''

''کیوں؟ کیوں؟'' نواب صاحب بول اٹھے۔

''ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ اس گیدڑ نے جنگل سے ایک شیر اور ایک چیتے کو پکڑ کر ان دونوں کی دُم ایک دوسرے سے باندھ دی اور چوراہے پر چھوڑ دیا۔ سارا گاؤں تماشہ دیکھ رہا ہے۔''

نواب صاحب کا سینہ دھک سے بیٹھ گیا۔ وہ کچھ اور سوچے، اس سے پہلے کلّو کلہاڑی دوڑتا ہوا آ پہنچا۔ پھر کہا، ''نواب صاحب نواب صاحب، نواب صاحب!''

''بولو!''

''نواب صاحب، نواب صاحب!''

''یہی کہنا ہے نا کہ تم نے ہماری قبر کھود کر تیار کر کھی ہے؟''

''لو! وہ تو میں بھول ہی گیا!'' کلّو کلہاڑی نے بتایا، ''لیکن اس کے لیے ابھی وقت کافی ہے۔ پہلے آپ تیار ہو جائیے۔ وہ آ رہا ہے۔''

''کون آ رہا ہے؟''

''وہی کھوسٹ۔ اسے پتہ چل گیا ہے کہ آپ نے اسے گرفتار کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے کلّو کلہاڑی الٹے پاؤں قبرستان کی طرف دوڑ گیا۔

شیر سنگھ بھی دوڑنے کے معاملے میں اولمپک رنر ملکھا سنگھ سے کم نہیں تھا۔ وہ کلّو کلہاڑی کے پیچھے اپنے مکان کی طرف بھاگ نکلا۔ نواب صاحب دیکھتے ہی رہ گئے۔

''بیگم!'' پھر چارپائی کے نیچے گھستے ہوئے وہ بولے، ''کہا سنا معاف کرنا۔ ہماری موت آ رہی ہے۔''

اب تک بیگم سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ کہا، ''لو، میری یہ چوڑیاں پہن لو!''

''ایں!''

''مرد ہو کر موت سے ڈرتے ہو!''

''ہم نے کب کہا کہ ہم موت سے ڈرتے ہیں؟''

''تب نکلو چارپائی کے نیچے سے باہر!''

''نکلیں گے!'' نواب صاحب نے اور چھپتے ہوئے کہا، ''نکل کر شہید بھی ہوں گے۔ پھر تم یہ مت کہنا کہ اکیلے زندگی نہیں کٹتی۔''

بیگم رنگیلی کھی کھی کر ہنس دی۔

''یہاں ہمیں پسینہ چھوٹ رہا ہے اور تمھیں ہنسی آرہی ہے؟''

''بات ہی ایسی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''پہلے یہ بتاؤ کہ آپ کو وہ بوٹی کس نے دی تھی؟'' بیگم نے پوچھا۔

نواب صاحب نے چارپائی کے نیچے سے سر باہر نکالتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ پل بھر سوچا۔ یاد آ گیا۔ کل صبح صبح دہاڑ علی آیا تھا۔ دہاڑ علی پڑوس والے طبلا گنج کا مکھیا تھا اور طبلا گنج پاکستان کا ایک گاؤں تھا۔ (جب طبلا گنج میں مرغیاں انڈے دینے سے انکار کر دیتی ہیں تب دہاڑ علی سرحد پار کر نگاڑا پور میں انڈوں کی تلاش میں آ جاتا ہے۔) نواب صاحب نے دہاڑ علی کو دو درجن انڈے دیے تھے۔ بدلے میں اس نے ایک بوٹی دی تھی۔ ایسی معجزاتی جڑی بوٹی کہ بوڑھا کھائے تو جوان ہو جائے۔

نواب صاحب بھلے ہی ساٹھ سال کے ہوں، وہ آج بھی اپنے کو جوان سمجھتے تھے۔ کراماتی بوٹی ان کے لیے نکمّی تھی۔ وہی بوٹی انھوں نے ننانوے سال کے بوڑھے کو دے دی۔

''اب یہ یاد کرو کہ دہاڑ علی نے بوٹی کے بارے میں کیا بتایا تھا؟'' بیگم نے پھر پوچھا۔

''کیا بتایا تھا؟'' سوال کے ساتھ انھیں جواب بھی یاد آ گیا۔ بوٹی کا اثر صرف چوبیس گھنٹے رہتا ہے۔ دہاڑ علی نے ایسا ہی کچھ کہا تھا۔

نواب صاحب چارپائی کے نیچے سے باہر نکلے اور بیگم کی کمر میں ہاتھ ڈال کر انگریزی ڈانس کرنے لگے۔

''ہائے اللہ!'' بیگم شرما کر بولی، ''کوئی دیکھ لے گا تو!''

''تو کیا؟'' نواب صاحب نے گدگدی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا، ''نکاح پڑھ کر لائے ہیں، تمھیں بھگا کر نہیں لائے۔''

''توبہ، توبہ! کیسی بے تکی باتیں کرتے ہیں آپ!''

اور تنگ کی بات یہ ہے کہ چوبیس گھنٹے پورے ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ گھڑی پر آنکھیں ٹھہرتے ہی نواب صاحب کو یہ خیال آیا۔ تبھی دور سے گیند کی طرح اچھل کر آتا ہوا بڈّھا نظر آیا۔ ستیاناس!

نواب صاحب نے دھڑام سے دروازے بند کر لیے۔ اب کیا کریں؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو الماری کھول اندر کھڑے ہو گئے۔ اندر سے الماری کا دروازہ بھی بند کر لیا۔ دو دروازوں کے بیچ صرف اتنی جگہ رکھی تاکہ سانس چلتی رہے۔

کچھ ہی پلوں میں یم کا باپ، بڈّھا آ پہنچا۔ اس نے نہ آواز دینے کی زحمت کی، نہ دروازہ کھٹکھٹانے کی۔ صرف ایک ہی لات ماری اور دونوں دروازے دھڑام سے گر گئے۔

''کہاں ہے جنگ بہادر کی دُم؟'' کچن کے دروازے سے جھانکتی، کانپتی بیگم رنگیلی سے اس نے اونچی آواز میں پوچھا۔

بیگم چپ ہی رہی۔

''میں پوچھتا ہوں، وہ تیس مار خاں کہاں ہے، جس نے مجھے چیلنج دیا؟''

''وہ... وہ تو پچھلے دروازے سے..''

''جھوٹ!'' بیگم کچھ اور کہے اس سے پہلے بوڑھا پھر دہاڑا، ''اس دروازے سے جانے کے پہلے میں پچھلا دروازہ باہر سے بند کرتا آیا ہوں۔ اب بتاؤ اس گیدڑ کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟''

گیدڑ لفظ سننا تھا کہ نواب صاحب کی کھوپڑی بھنّا گئی۔ وہ فوراً الماری سے باہر نکلے اور کہا، ''ہم شیر کی اولاد ہیں۔ جنگ بہادر نواب رنگیلے ہیں۔ کوئی مذاق نہیں، ہاں۔''

ننانوے سال کا بوڑھا پل بھر دیکھتا رہ گیا تو نواب صاحب نے دوسرا بم پھینکا، ''واللہ، ہم نے تمھیں جوانی بخشی ہے اور ہم ہی تمھیں بڑھاپا واپس دیں گے۔ کہو، کیسے لڑیں گے؟''

''ایں...!'' بوڑھا چونکا۔

''جیمس بانڈ اسٹائل، بروس لی اسٹائل، امیتابھ بچن اسٹائل یا پھر پنڈا اسٹائل میں مقابلہ ہو جائے؟''

بوڑھا سوچ میں پڑ گیا۔ طرح طرح کی کشتیوں کے بارے میں اس نے سن رکھا تھا۔ لیکن یہ پنڈا

اسٹائل کس بلا کا نام ہے؟

''پنڈا اسٹائل یعنی کہ کون سب سے زیادہ لڈّو کھاتا ہے۔'' نواب صاحب نے بات صاف کی، اگر تم کھالو تو ہم گیدڑ اور ہم جیتے تو تم گیدڑ، قبول؟''

بوڑھے کو اس وقت کافی بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے ہاں کر دی۔ بیگم نے فوراً دسترخوان بچھایا۔ ترچھی آنکھوں سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی بھی بیس منٹ باقی تھے۔

''کہو، بڑے میاں!'' لڈّو کا تھال آتے ہی نواب صاحب نے پوچھا، ''پہل کون کرے گا؟''

''اماں، ہم پہل کریں گے تو آپ کی باری ہی نہیں آئے گی۔'' بوڑھے نے فخر سے کہا۔

''ٹھیک ہے،'' نواب صاحب نے پہلا لڈّو اٹھاتے ہوئے کہا، ''ہم ہی بسم اللہ کرتے ہیں۔ گنتے جاؤ۔''

بوڑھے نے اونچی آواز میں کہا، ''ایک۔''

نواب صاحب نے ایک لڈّو پورا کیا اور دوسرا اٹھایا۔

بوڑھے نے کہا، ''دو۔''

نواب صاحب ایک کے بعد ایک لڈّو اٹھاتے جا رہے تھے اور کھاتے جا رہے تھے۔ کھاتے جا رہے تھے اور تعریف کرتے جا رہے تھے، ''واہ بیگم، کیا لڈّو بنایا ہے! قسم خدا کی، یہ ذائقہ قیامت تک یاد رہے گا۔''

دس لڈّو کھانے کے بعد نواب صاحب نے گلاس بھر کر پانی پیا۔

''بس؟'' بوڑھے نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''بڑے میاں، ابھی تو ہم نے ڈکار بھی نہیں لی۔''

''یعنی؟''

''یعنی کہ کھانا تو ڈکار لینے کے بعد ہی شروع ہوگا۔''

''ایں!'' بوڑھے نے پہلی بار کمزوری محسوس کرتے ہوئے پوچھا، ''تو اب تک آپ کیا

کرر ہے تھے؟''

''چکھ رہے تھے۔'' کہتے ہوئے انھوں نے ڈکار لی۔اور پھر لڈّ وکھانا شروع کیا۔بیگم کی نظریں بار بار گھڑی کی طرف جارہی تھیں۔ابھی بھی دس منٹ باقی تھے۔

نواب صاحب نے اور پندرہ لڈّ وکھائے اور پھرایک بار پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''بس؟''بوڑھے نے پوچھا۔

''اماں، یہ تو انٹرول ہوا،''نواب صاحب پانی کا دوسرا گلاس ختم کرتے ہوئے بولے،''ابھی تو اور پندرہ لڈّ وکھانے ہیں۔''

بوڑھے کو چکّر آ گئے۔نواب صاحب سمجھ گئے- بوڑھے کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔''بڑے میاں اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہو؟ آپ بھی شروع ہو جاؤ۔''

بوڑھے نے بالکل بڈّھے کی طرح ایک لڈّ واٹھایااورابھی آدھا بھی ختم نہیں ہوا کہ کھانسنے لگا۔

''لو!''نواب صاحب نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا،''انٹرول کردو۔''

''بس!''بوڑھا بول اٹھا،''اپنی فلم تو یہیں پوری ہوتی ہے۔''

ننانوے سال کا جوان چوبیس گھنٹے پورے ہوتے ہی پھر سے ننانوے سال کا بوڑھا بن گیا۔

دینے والا جب بھی دیتا...

آخر چناؤ کی تاریخ طے ہوگئی اور نگاڑا پور کی پُرسکون زندگی میں گرمی آگئی۔ چونکہ غضب علی پہلوان کا اکھاڑا نگاڑا پور میں ہے، اس میں بھی چستی آنا یقینی تھی۔

سوال تھا نئے نشان کا۔

مولوی علی ولی اپنے گروہ کے پہلوانوں سے مشورہ کرنے لگے، ''پچھلی بار ہم نے چناؤ نشان چاند تارے والا ہرا جھنڈا رکھا تھا۔ اس نشان پر سارے مسلمانوں کے ووٹ تو ہمیں ملے لیکن ایک بھی ہندو نے ہمیں ووٹ نہیں دیا۔''

''ٹھیک ہے۔'' غضب علی بولا، ''اب کی ہم الّو کو اپنا نشان بناتے ہیں۔''

''ایں! اُلّو کیوں؟''

اُلّو سبھی کا پیارا ہے۔'' اس نے دلیل پیش کی، ''اُلّو لفظ کا استعمال ہندو مسلمان، سکھ عیسائی سبھی پیار سے کرتے ہیں۔''

''اُلّو کے پٹھے!'' مولوی صاحب بھڑک اٹھے، ''کیا تم ہماری پارٹی کی جگ ہنسائی کروانا چاہتے ہو؟''

غضب علی خاموش ہوگیا تو دوسرا پہلوان بولا، مولانا ایک بہتر آئیڈیا سوجھا ہے۔''

سبھی کی آنکھیں اس پر ٹکیں۔

''کیا ہے؟'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

''ایک ایسا نشان جو ہمارے اور ہنومان اکھاڑے کے بیچ ٹھوس کڑی کے برابر ہے۔''

''ابے، وہ ہے کیا؟''

''لنگوٹ۔ دونوں اکھاڑے کے پہلوانوں کا پیارا، لنگوٹ!''

مولوی صاحب نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں دکھائیں تو وہ بھی چپ ہوگیا۔ اب تیسرے پہلوان کی باری تھی۔ اس نے کہہ دیا، ''اُلّو نہ سہی، لنگوٹ نہ سہی، تب جوتا ہی نشان ہوسکتا ہے۔''

''جوتا کیوں؟'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

''اس لیے کہ جوتا چلانے میں سبھی کو بڑا مزہ آتا ہے۔'' اس نے فخر سے کہا، ''ہمارے نگاڑاپور کے لوگ بڑے چاؤ سے جوتا چلاتے ہیں۔ شوہر میاں بیوی پر تو بیوی شوہر میاں پر۔ ابّا حضور بیٹوں پر تو بیٹے ابّا حضور پر۔ ماسٹر بچّوں پر تو بچّے ماسٹر پر۔ یہ نشان جتنا پرانی نسل کو پیارا ہے، اتنا ہی نئی نسل کو بھی۔ بوڑھے، جوان، ہندو، مسلمان سبھی جوتے کو ووٹ دے دیں تو تعجب نہیں۔''

بات مولوی صاحب کے لیے بھی تعجب کی تھی۔ اس لیے نہیں کہ نشان اچھا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ نگاڑاپور کے ایک پہلوان نے عقلمندی کی بات کہی تھی۔ مولوی صاحب کی پارٹی کا نیا نشان طے ہوگیا۔

اِدھر پنڈت ماکھن لال کی بھی پریشانی وہی تھی۔ پچھلی بار انھوں نے اپنا چناؤ نشان ترشول والا بھگوا جھنڈا رکھا تھا۔ اس نشان پر سبھی ہندوؤں نے جم کر ووٹ ڈالے۔ لیکن قسم کھانے کو ایک بھی مسلمان کا ووٹ انھیں نہیں ملا تھا۔

''نشان تو ایسا ہونا چاہیے کہ ہندو مسلمان تو کیا، سکھ عیسائی بھی اپنا پن محسوس کریں۔'' پنڈت جی نے ہنومان اکھاڑے کے پہلوانوں کو بتایا، ''اور مل میں کام کرنے والے ہریجن مزدور یہ سمجھیں کہ وہ نشان ان کا اپنا ہی ہے۔''

''پنڈت جی!'' پہلوان پکوڑی مل بول اٹھا، ''ایسا ہی ایک نشان مجھے سوجھ رہا ہے۔''

''بتاؤ۔''

''گدھا۔''

''گدھا کیوں؟'' پنڈت جی نے پوچھا۔

''کیونکہ وہ سبھی کے کام آنے والا جانور ہے، ایسا میں نے دوسری جماعت میں پڑھا تھا۔''

''گدھے سے بہتر تو پاجامہ رہے گا۔'' دوسرے پہلوان نے مشورہ دیا

تبھی تیسرا بول اٹھا، ''اماں پاجامے میں کیا رکھا ہے۔''

چوتھا بولا، ''ٹانگ۔''

''ٹانگ!'' پنڈت جی مسکرا اٹھے، ''اس سے بہتر نشان اور کیا ہوسکتا ہے؟ کسی عظیم انسان نے سچ ہی کہا ہے، ٹانگ اڑانا ہمارا پیدائشی حق ہے۔''

''وہ عظیم انسان ہے کون؟'' کسی نے پوچھا۔

''پنڈت ماکھن لال۔'' اُن کے پاس جواب حاضر تھا، ''اگر نہ ہو یقین تو کسی بھی سرکاری دفتر میں کوئی بھی کام لے کر پہنچ جاؤ۔ قدم قدم پر تمھارے کام میں کوئی نہ کوئی ٹانگ اڑائے گا ہی۔ ٹانگ اڑانے میں جو لطف ہم سب کو آتا ہے کسی اور بات میں کہاں؟''

پنڈت ماکھن لال کی پارٹی کا نیا چناؤ نشان طے ہوگیا۔ ٹانگ کے پوسٹر بننے شروع ہو گئے۔ دوسرے ہفتے سے ٹانگ کے پوسٹر دیواروں پر نظر آنے لگے۔ تیسرے ہفتے سے بھونپو والی جیپیں گلیوں میں گھومنے لگیں۔

ننانوے سال کے بوڑھے نے جب ایک ہی دیوار پر دس ٹانگیں دیکھیں تو وہ پوچھ بیٹھا، ''اماں، یہ ٹانگیں کس کی ہیں؟''

تبھی پنڈت جی وہاں سے جیپ میں گزر رہے تھے۔ جیپ روک کر انھوں نے کہا، ''ٹانگ تو راشٹری ایکتا کا پرتیک (قومی اتحاد کا مظہر) ہے۔ ہوسکتا ہے، اس میں سے ایک آدھ ٹانگ تمھاری ہی ہو۔''

ننانوے سال کے بوڑھے نے نظریں گھمائیں تو ایک ساتھ کئی جوتے سامنے آ گئے۔ اس دیوار پر جوتے کے پوسٹر چپکے ہوئے تھے۔ ''اور یہ جوتے کس کے ہیں؟'' وہ پھر بولا۔

پنواڑی کے پاس جیپ روک کر پان کھا رہے مولوی صاحب نے یہ سوال سنا اور جواب دینا ان کے لیے واجب ہوگیا۔

وہ بولے، ''جوتے انسانوں کے ہوا کرتے ہیں۔جس ملک کے پاس جتنا بڑا جوتا ہوتا ہے وہ ملک اتنا بڑا کہلاتا ہے۔جوتا کہیں بھی، کسی بھی موسم میں چل سکتا ہے۔اسے کوئی بھی چلا سکتا ہے۔یاد رہے، سفر کا ساتھی–جوتا۔ہر مشکل کا حل–جوتا۔جوتی کا شوہر، چپل کا بھائی اور بوٹ کا اکلوتا بیٹا–جوتا۔سب کا پیارا، سب سے نیارا، یہ جوتا۔ہمارا جوتا، تمھارا جوتا۔تمھارا ووٹ ہمارا جوتا۔''

مولوی صاحب ایک ہی سانس میں دندناتے ہوئے ایسے بول گئے کہ ننانوے سال کے بوڑھے کے ساتھ چورا ہے پر اکٹھا سبھی لوگ تالیاں بجا اٹھے۔

پنڈت ماکھن لال کو تاؤ آ گیا۔وہ اپنی جیپ میں کھڑے ہو گئے۔پھر بھونپو میں منہ ڈال کر باضابطہ بھاشن جھاڑا۔''میرے پیارے بھائیو اور بہنو! آپ اپنا قیمتی ووٹ کسی کو دینے سے پہلے یہ سوچ لیں کہ جوتا آخر ہے کیا؟ اور وہ بھی جان لیں کہ اگر ٹانگ ہے تو جوتا ہے۔ٹانگ نہیں تو جوتا بھی نہیں۔''

اُنھیں کوئی روک نہیں رہا تھا۔پھر بھی وہ بولے، ''مجھے کہنے دو کہ ہر جوتے کی جگہ پیروں کے نیچے ہوتی ہے۔ہر پیر جوتے کو رگڑتا ہے، گھستا ہے اور پھر کوڑے میں پھینک دیتا ہے۔اب آپ ہی طے کریں کہ آپ اپنا قیمتی ووٹ کسے دیں۔''

مولوی علی ولی سناٹے میں آ گئے۔لیکن صرف کچھ پلوں کے لیے۔فوراً انھوں نے اپنا بھونپو پنڈت جی کی طرف گھمایا اور شروع ہو گئے۔''یہ سچ ہے کہ جوتے کی جگہ پیروں میں ہوتی ہے۔جیسے کہ ایک شاگرد کی جگہ استاد کے قدموں میں ہوتی ہے۔جیسے ایک وفا شعار بیوی کی جگہ اپنے شوہر کے قدموں میں ہوتی ہے۔جوتا تو ہمدردی کا مظہر ہے۔لیکن مہربانی کر کے اسے کوئی کمزور نہ سمجھے۔''

اُنھیں بھی کوئی روک نہیں رہا تھا۔پھر بھی وہ بولے، ''مجھے کہنے دو کہ جب کوئی شاگرد گورکھ ناتھ سر اٹھاتا ہے تو استاد مچھندر ناتھ کی ٹانگیں بھی کانپ اُٹھتی ہیں۔جب نگاڑا پور کی عورت سر اٹھاتی ہے، تو اچھے اچھے مردوں کے سر گنجے کر کے رکھ دیتی ہے۔''

ابھی بھی انھیں کوئی روک نہیں رہا تھا۔''مجھے کہنے دو کہ جوتا صرف ہتھیار نہیں، لباس بھی ہے۔یہ تلوار کی طرف ہاتھ میں رکھ کر چلایا جا سکتا ہے اور بم کی طرح پھینک کر بھی مارا جا سکتا ہے۔پھر چاہے کیسی

بھی مضبوط ٹانگ سامنے کیوں نہ ہو، نو دو گیارہ ہو جاتی ہے۔ مجھے کہنے دو کہ ٹانگ تاناشاہی کی نشانی ہے۔ ہٹلر نے ساری دنیا میں اڑانے کی کوشش کی اور نتیجہ کیا نکلا؟ انسانیت کے جوتوں نے وہ ٹانگ توڑ کر رکھ دی۔ سوچو، بھائیوں سوچو! تاناشاہی ٹانگ یا لوک شاہی جاتا!''

پنڈت جی کے ساتھ ان کے گروہ والے ایک ساتھ بول اٹھے، ''ٹانگ، ٹانگ، ٹانگ!''

مولوی صاحب کے ساتھ ان کے گروہ والے گرج اٹھے، ''جوتا، جوتا، جوتا!''

چوراہا دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ ماحول میں سنسنی بڑھتی گئی۔ مانو سبھی کے سر پر شیطان بیٹھا ہو!

ٹانگ، ٹانگ، ٹانگ!

جوتا، جوتا، جوتا!

تبھی کسی نے ٹانگ اڑائی اور جوتا چل گیا۔ یہ دیکھ کر کلّو کلہاڑی سیدھا قبرستان کی طرف دوڑا۔ دو چار لاشیں گریں اس سے پہلے دو چار قبریں کھود کر تیار رکھنا اس کے لیے ضروری تھیں۔

اگر تھانے دار بندوقی لال وقت پر نہیں پہنچتا اور ہوا میں فائر نہیں کرتا تو کلّو کلہاڑی کی محنت ضائع بھی نہ ہوتی۔

''نیتاؤ اور ووٹرو!''۔ تھانے دار نے دونوں گروہوں کو مخاطب کر کے چناؤ والے اسٹائل میں کہا، ''نگاڑاپور کے امن میں اگر کسی نے پھر سے ٹانگ اڑانے کی یا جوتا چلانے کی جرأت کی تو ہمیں ڈنڈا گھمانے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ پھر یہ مت کہنا کہ پولیس والے زیادتی کرتے ہیں!''

اسی وقت کہیں سے اچھلتا ہوا ایک انڈا آیا اور تھانے دار کی ناک سے ٹکرا کر پھوٹ گیا۔ سبھی لوگ قہقہہ ما کر ہنس پڑے۔ لیکن بات ہنسنے کی نہیں تھی۔ سنجیدگی کی تھی۔ کیا تھی؟

دشمن کو کیسے پچھاڑا جائے؟ زیادہ سے زیادہ ووٹ کیسے قابو میں کیے جائیں؟ ہنومان اکھاڑے میں اسی موضوع پر مشورہ ہو رہا تھا۔ پنڈت جی کو سارے ہندوؤں کے ووٹ تو آسانی سے مل سکتے تھے لیکن مسلمانوں کے ووٹوں کا کیا؟

''ہاں...'' پکوڑی مل بولا، اُن مچھروں کے ووٹ ہمیں اس طرف گھسیٹنے کے لیے کوئی ٹوٹکا سوچنا

پڑے گا۔''

ہنومان اکھاڑے کے بڑے بڑے دماغوں کے ساتھ پنڈت ماکھن لال کا دماغ بھی تدبیر سوچنے میں لگ گیا۔

یہاں غضب علی کے اکھاڑے میں گرما گرم بحث چل رہی تھی۔ مولوی علی ولی کو بھی یہی ایک فکر کھائے جا رہا تھا۔ سارے مسلمانوں کے ووٹ تو ان کی جیب میں تھے لیکن...

''ہاں...'' غضب علی پھسپھسایا، ''ان کھٹملوں کو اس طرف گھسیٹنے کے لیے کوئی تدبیر سوچنی پڑے گی۔''

''نیکی کے کام میں دیر کیا، سویر کیا؟'' مولوی صاحب بولے، ''کوئی ایسی تدبیر سوچ نکالو کہ فتح کا سہرا ہمارے سر بندھے اور تم سبھی کے سر اونچے ہو جائیں۔''

''ایک علاج ہے۔'' غضب علی نے اپنے دماغ کو نچوڑ کر کہا، ''آج ہی رات میں ہم ہنومان اکھاڑے کے سبھی پہلوانوں کی دھنائی کر دیتے ہیں اور ایسی دھنائی کریں گے کہ سسُرے اگلے چناؤ تک سر نہیں اٹھا سکیں گے۔''

'لاحول ولا قو...'' مولوی صاحب نے تھوکتے ہوئے سبھی پہلوانوں پر لعنت برسائی، ''تم لوگ ہمیشہ مار پیٹ کی سوچتے ہو۔ کبھی عقل کی بات بھی سوچو!'' پہلوان کو غصہ آ گیا۔ بولا، ''اگر کسان کھیت کے بارے میں سوچے تو کیا غلط کہا جائے گا؟''

''نہیں۔''

''تب پہلوان دھنائی کے بارے میں سوچے تو اس میں بُرا کیا ہے؟''

''صرف اتنا کہ مہاتما گاندھی نے ہمیں اہنسا کا سبق سکھایا ہے۔ اہنسا کے ہتھیار سے ہم نے آزادی پائی ہے اور اہنسا کے راستے پر ہی ہمیں چلنا ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے ہی راستہ سجھایا، ''ہمیں کچھ ایسا کام کرنا ہوگا تا کہ ہمارے ہندو برادروں کو یہ احساس ہو کہ ہم ان کی بھلائی چاہتے ہیں؟''

''ایسا کام ہے ہی کیا؟''

''نہ ہوتو پیدا بھی کیا جا سکتا ہے۔''

''یعنی؟''

''سمجھو،'' اب مولوی صاحب اصل بات پر آئے، ''سرحد پار والے گاؤں طبلا گنج میں کافی سانپ بچھو ہیں۔''

''تو؟''

''یہاں سے دو سو بچّھو پکڑ کر ہندوؤں کی بستی میں چھوڑ دیے جائیں۔''

''پھر؟''

''پھر کیا! دو دن میں وہ لوگ بچھوؤں سے تنگ آ جائیں گے اور تبھی ہم بچھو مار و ابھیان شروع کر دیں گے۔''

غضب علی کے ساتھ اسکے چیلے بھی خوش ہوا ٹھے۔ ٹوٹکالا جواب تھا۔ ایک ہی داؤں میں ہندوؤں کی ساری بستی کی ہمدردی پلٹ کر اس طرف آ سکتی تھی۔

پہلی پریشانی - بچھو پکڑنے کون جائے؟ مولوی صاحب کے گروہ کا کوئی بھی ممبر جا نہیں سکتا تھا۔ اس میں راز کھل جانے کا ڈر تھا۔ راز کا پتہ حزب مخالف کو چل گیا تو دنگا فساد ہونے کا بھی خطرہ تھا۔ آخر سبھی نے مل کر طے کیا کہ یہ کام نواب رنگیلے کو سونپا جائے۔

نواب صاحب اپنی مرغیوں کے ڈربے کھول رہے تھے کہ مسواک کرتا ہوا غضب علی آ پہنچا۔

''کیا بات ہے پہلوان؟'' نواب صاحب نے مرغیوں کو باہر کھدیڑتے ہوئے پوچھا، ''آج صبح صبح ہماری یاد کیسے آ گئی؟''

''بات ہی کچھ ایسی ہے؟''

''کہوتو ہم بھی جانیں۔''

''بات راز کی ہے۔'' کہتے ہوئے غضب علی نے مسواک کو موڑ کر زبان صاف کی اور گلے سے شیر کے غرّانے کی آواز نکالی۔ پھر بولا، ''سو بچّھو چاہئیں۔''

''ایں...! کیا کہا؟''

غضب علی نے اپنا جملہ دہرایا،''من چاہی قیمت دیں گے۔سوچ لو۔''

''لیکن سونچھوؤں کا تم کرو گے کیا؟ آملیٹ بناؤ گے؟''

''ہم چاہے آملیٹ بنائیں یا پلاؤ،'' غضب علی نے تمک کر کہا،'' آپ سے کوئی مطلب؟''

''ٹھیک ہے!'' نواب صاحب نے جیب سے ایک پرچہ نکال کر اس کے آگے کیا،''یہ لوریٹ کارڈ۔''

''ریٹ کارڈ!''

''یعنی الگ الگ جانوروں کے شکار کے الگ الگ قیمت کی فہرست۔''

غضب علی نے سر کھجلاتے ہوئے فہرست پر نظر ڈالی سب سے اوپر شیر کے شکار کی قیمت تھی۔

شیر زندہ -/10,000 روپے نقد

شیر مردہ -/8,000 روپے نقد

(ایک شیر مارنے کے آرڈر پر دو گیدڑ مفت)

فہرست کافی لمبی تھی۔نواب علی کو بچھوؤں کے سوا اس وقت اور کسی جانور میں دلچسپی نہیں تھی۔اس نے بچھو کے دام دیکھے۔زندہ یا مردہ ایک بچھو کا دام صرف دس روپیہ تھا۔اس نے نواب صاحب کو پانچ سو روپے پیشگی دیے۔

''کل رات باقی روپے لے کر آ جانا۔'' نواب صاحب نے نوٹ گنتے ہوئے کہا،''تمھارا مال تیار ہوگا۔''

غضب علی کو گئے ابھی کچھ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ پکوڑی مل آ دھمکا۔

''پہلوان!'' نواب صاحب نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا،''کہیں راستہ تو نہیں بھولے؟''

''راستہ بھی ٹھیک ہے اور آدمی بھی آپ کام کے ہیں۔''

''سو تو ہم ہیں ہی۔''

''تب آپ ہی ہماری مدد کر سکتے ہیں۔''

''چناؤلڑنے کے لیے چندہ چاہیے؟''

''نہیں۔''

''تب؟''

''سو سانپ پکڑنے ہیں!''

''ایں...! کیا کہا؟''

پکوڑی مل نے اپنا جملہ دہرایا،''من چاہے دام مل سکیں گے۔سوچ لو۔''

''سوچ لیا۔لیکن سو سانپ کا تم کروگے کیا؟اچار ڈالوگے؟''

''ہم چاہے اچار ڈالیں یا غبارے بنائیں،'' پکوڑی مل نے چڑھ کر کہا،''آپ سے مطلب؟''

نواب صاحب نے اب کی ریٹ کارڈ پیش نہیں کیا،سوچا چناؤ کے دنوں میں روپیوں کی ندی بہتی ہے۔جو کوئی چاہے،اپنی جیب بھر لے۔ویسے ریٹ کارڈ میں ایک سانپ کی قیمت چودہ روپے ننانوے پیسے تھے۔نواب صاحب نے پورے پندرہ روپے بتائے۔سودا طے ہوگیا۔

''یہ لو ڈیڑھ ہزار روپے پیشگی،'' پکوڑی مل نے نوٹ گھماتے ہوئے دھمکی بھی دی،''لیکن یاد رہے، بات راز کی ہے۔''

''ٹھیک ہے،''نواب صاحب نے نوٹ گنتے ہوئے کہا،''کل رات میں باقی روپے لے کر آجانا، تمھارا مال تیار ہوگا۔''

چناؤ کی ہوا کیا چلی کہ بیگم رنگیلی بھی اس کی چپیٹ میں آگئی۔

''سنتے ہو...!''

''ہم بہرے نہیں ہیں۔''نواب صاحب نے بچھو اور سانپ کے آرڈر کا حساب جوڑتے ہوئے جواب دیا،''ہمارے کان آج بھی ثابت ہیں۔آج بھی ہم چیونٹیوں کی گفتگو سن سکتے ہیں۔''

دُکھ تو اس بات کا ہے کہ آپ کی عقل ماری گئی ہے!''

''کیوں؟ کیوں؟''

''اگر آپ چناؤ میں کھڑے ہو جائیں تو ہم پھر ایک بار نوابی بھوگ سکتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟'' نواب صاحب نے پوچھا۔

''اب آج کے نیتا اور کل کے نوابوں میں فرق ہی کیا رہ گیا ہے؟'' بیگم بولی، ''پہلے جو عیش نواب لوگ کرتے تھے، آج وہی مزے نیتا لوگ اڑا رہے ہیں۔''

''ہاں... '' نواب صاحب کی آنکھیں پھیل گئیں، ''بات تو سوچنے کی ہے۔ لیکن ہمارے پاس اتنا روپیہ کہاں کہ ہم چناؤ لڑ سکیں؟''

''اپنی جیب کا پیسہ لگا کر تو مولوی صاحب اور پنڈت جی بھی چناؤ نہیں لڑتے۔''

''تب کس کا روپیہ لگاتے ہیں؟''

''ہمارے یہاں جو مِل ہے نا،'' بیگم نے بازار سے سنی بات بتائی، ''اس کا مالک ظالم سنگھ دونوں گروہوں کو چناؤ لڑنے کے لیے چندہ دیتا ہے۔ آپ جا کر مانگیں گے تو آپ کو بھی دے گا۔''

''واہ، ہم اس سے کیوں مانگیں؟''

''تو؟''

''ہم اسی سے کیوں نہ مانگیں جس سے وہ خود مانگتا ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ہم مانگیں گے تو اپنے خدا سے، کسی اور سے نہیں۔''

بیگم نے سر پیٹ لیا۔

دوپہر کی نماز ختم کر نواب صاحب نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اونچی آواز میں کہا، ''اللہ میاں تم تو جانتے ہو کہ ہم تمھارے سچے بندے ہیں۔ آج تک ہم نے تم سے کچھ بھی نہیں مانگا۔ لیکن آج تم سے ایک لاکھ روپیہ مانگنے پر ہم مجبور ہوئے ہیں۔ کیا کریں؟ نگاڑاپور میں چناؤ لڑنے کے لیے کم سے کم ایک لاکھ روپیہ تو لگتا ہے۔ پروردگار چوبیس گھنٹوں میں دے دو تو یہ بندہ زندگی بھر تمھارا شکر گزار رہوگا۔''

سرحد پار والے طبلا گنج کا مکھیا داڑعلی کچھ دیر پہلے آ کر آنگن میں رُک گیا تھا۔ نواب صاحب کی دُعا

سن کر وہ مسکرادیا۔ پھر دہاڑا، ''نماز ختم۔ دُعا ختم۔ نواب صاحب، اب میں اندر آ سکتا ہوں؟''

''آیئے، آیئے!'' نواب صاحب نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا، ''تشریف لایئے! کیا پھر طبلا گنج میں انڈوں کا قحط پڑا ہے؟''

''ایسا ہی سمجھو۔'' کہتے ہوئے انھوں نے مذاق میں جوڑا، ''کبھی کبھی ہمیں یہ شک ہونے لگتا ہے کہ کہیں آپ لوگ تو ہماری مرغیوں کو نہیں بہکاتے؟''

نواب صاحب نے بھی ہنستے ہنستے جتادیا، ''میاں جس دن ہم لوگ آپ کی مرغیوں کو چھیڑیں گے اُس دن مرغیاں انڈے دینا تو نہیں چھوڑیں گی، طبلا گنج ہی چھوڑ دیں گی۔''

دہاڑعلی قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ پھر کہا، ''اب دھندے کی بات۔''

''دھندا؟ کاہے کا دھندا؟''

''کیوں؟ کیا انڈے مفت دینے کا خیال ہے؟''

''بالکل مفت!'' نواب صاحب نے دریا دلی سے کہا، ''لیکن ایک شرط ہے۔''

''کہیے۔''

''آپ کے طبلا گنج میں سانپ بچھو کافی تعداد میں ہیں۔ آپ کو انڈے چاہئیں، ہمیں سانپ بچھو۔ ایک انڈے کے بدلے میں ہم آپ سے ایک بچھو لیں گے اور ایک سانپ کے بدلے میں ہم آپ کو دو انڈے دیں گے۔ بولو ہے قبول؟''

دہاڑعلی پھر دہاڑا، ''قبول!''

ساری باتیں طے ہو گئیں۔ دہاڑعلی طبلا گنج لوٹ آیا اور اپنے نوکر سے شام تک سَو بچھو اور سَو سانپ پکڑ لانے کا حکم دیا۔ اب یہ نوکر تھا آلسی۔ اس نے سوچا، کون تھیلا کھول کر دیکھنے کی ہمت کرے گا کہ اندر سانپ بھرے ہیں یا بچھو؟ اس نے دو سو چوہے پکڑ کر دو تھیلوں میں بھر دیے۔

دیر شام میں بڑے بڑے تھیلے نواب صاحب کے مکان پر آ گئے۔ ایک تھیلے پر لکھا تھا - سانپ۔ دوسرے پر لکھا تھا - بچھو۔ نواب صاحب خوش ہو گئے۔

رات میں غضب علی بچھو کا تھیلا لینے آیا تو نواب صاحب نے ایک تھیلا اسے تھما دیا۔ تب اس کی نظر دوسرے تھیلے پر ٹھہری۔ اس نے باقی روپے دیتے ہوئے پوچھ لیا، ''یہ تھیلا کاہے کا ہے؟''

''اس سے آپ کو مطلب؟''

''پھر بھی...''

''دیکھو میاں!'' نواب صاحب نے کہا، ''اس میں سَو سانپ ہنومان اکھاڑے کے لیے ہیں۔ چونکہ یہ بات راز کی ہے، ہم آپ کو نہیں بتا سکتے۔ کیا سمجھے؟''

غضب علی سمجھ گیا۔ اپنا تھیلا کندھے پر ڈال وہ تیزی سے دوڑتا ہوا اکھاڑے پر آیا تو مولوی علی ولی کے ساتھ باقی پہلوان اس کا بے چینی سے انتظار کرتے ہوئے بیٹھے تھے۔

''غضب ہو گیا مولانا!'' مولوی صاحب کے آگے تھیلا رکھتے ہوئے وہ بول اٹھا، نواب صاحب کو ہم نے سَو بچھوؤں کا آرڈر دیا تو پنڈت جی نے سَو سانپ کا۔''

''ایں...!'' مولوی صاحب کی سانس رُک گئی، ''تمھیں یقین ہے کہ...''

''خود نواب صاحب نے بتایا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایسا دوسرا تھیلا بھی وہاں دیکھا ہے۔''

مولوی صاحب کا دماغ تیز رفتار سے کام کرنے لگا۔ فوراً انھوں نے ایک نئی چال سوچ نکالی اور ایک نیا فرمان جاری کیا، ''اس تھیلے کو یہاں کہیں دفن کر دو۔''

''پھر؟''

''پھر کیا؟'' وہ بولے، ''تھانے میں ہم دنگے کے سازش کی رپورٹ درج کروا کے پنڈت جی کو گرفتار کروا دیں گے۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا اور پنڈت جی کو سزا ہو گئی تو چناؤ سے اس کا نام ہی کٹ جائے گا۔''

''واہ!''

غضب علی خوش ہو کر بول اٹھا، ''اسے ہی تو ہم پہلوان لوگ قینچی مارنا کہتے ہیں۔''

فوراً ایک گڈھا کھودا گیا اور تھیلا گاڑ دیا گیا۔ تب تک مولوی صاحب تھانے دار بندوقی لال کو اپنے ساتھ لے کر ہنومان اکھاڑے آ پہنچے تھے۔

ہنومان اکھاڑے میں پنڈت جی کے ساتھ پکوڑی مل اور ان کے چیلے سوچ میں ڈوبے ہوئے بیٹھے تھے۔ بیچ میں تھیلا پڑا تھا۔

''بندوقی لال!'' مولوی صاحب گہری سانس لے کر چلائے، ''کرلو اس دیش کے دشمن کو گرفتار اور کردو اندر!''

پنڈت جی پہلے تو چونکے، پھر مسکراتے ہوئے پوچھا، ''کس خوشی میں؟''

''چناؤ کی چڑیا آپ کے ہاتھ سے اڑ گئی، اُس خوشی میں!'' اب کے مولوی صاحب دہاڑے، ''اُس تھیلے میں کیا ہے؟''

''کیا ہے؟''

''ہم سب کچھ جانتے ہیں۔'' تھانے دار کی طرف مڑتے ہوئے انھوں نے کہا، ''اُس تھیلے میں سَو سانپ ہیں۔ یہ سانپ مسلمانوں کی بستی میں چھوڑ کر پنڈت جی خوف پھیلانا چاہتے ہیں۔ دنگے فساد کے بیج بونا چاہتے ہیں۔''

''پنڈت جی!'' اب کے تھانے دار نے منہ کھولا، ''سچ سچ بتاؤ، اس تھیلے میں کیا ہے؟''

''تم خود ہی دیکھ لو۔''

تھانے دار چونکا۔ اگر تھیلا خود کھولے اور اندر سچ مچ ہی سانپ بھرے ہوں تو...

''مولانا!'' تھانے دار اس کی طرف مڑا، ''شک آپ کو ہے۔ میں آپ کو تھیلا کھول کر دیکھنے کی اجازت دیتا ہوں۔''

مولوی صاحب اوپر سے نیچے تک کانپ اٹھے۔

''اماں، ہمیں شک تھوڑے ہی ہے۔'' وہ بولے، ''ہمیں تو یقین ہے۔''

تھانے دار نے کہا، ''لیکن پنڈت جی کو گرفتار کرنے کے لیے ہمیں بھی یقین ہونا چاہیے کہ نہیں؟''

''تب تم خود ہی تھیلا کھول کر کیوں نہیں دیکھ لیتے؟''

''لو۔'' پنڈت جی نے کہا، ''ہم ہی تھیلا کھول دیتے ہیں۔''

تھیلے کا منہ مولوی صاحب کی طرف گھما کر انھوں نے کھولا تو ایک ساتھ کئی چوہے کود کر مولوی صاحب کی طرف دوڑ گئے۔ مولوی صاحب ایسے بھاگے کہ مڑ کر پیچھے دیکھنے کی جرأت تک نہیں کی۔

نواب رنگیلے نے خدا کو چوبیس گھنٹے کی مہلت دی تھی۔ آخری تیئس گھنٹوں میں انھوں نے چناؤ فنڈ کے لیے ہر نماز کے بعد دعا مانگی تھی۔ لیکن یہ خدا بھی کیسا ظالم تھا! اب تک اس نے اپنے اکلوتے نیک بندے کے چناؤ فنڈ میں ایک دھیلا بھی نہیں ڈالا تھا۔ تب نواب صاحب کو خیال آیا کہ ان کا چھپّر اتنا مضبوط ہے کہ پھٹ بھی نہیں سکتا۔ اب خدا کے پاس اتنا وقت کہاں کہ کلّو کلہاڑی کا کام بھی خود کریں۔

کل رات انھوں نے کلّو کلہاڑی کو چھپّر پر چڑھا کر چھپّر میں بڑا چھید کروالیا تھا۔ انھوں نے فجر کی دو رکعت نماز پڑھی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

''اللہ میاں اب تو صرف چند ہی منٹ بچے ہیں۔'' وہ کچھ ناراضگی کے ساتھ کہہ رہے تھے، ''مہلت کا وقت ختم ہونے کے بعد تم ہمیں دس لاکھ روپے بھی دو گے تو ہم نہیں لیں گے۔ ہم نے کہہ دیا سو کہہ دیا۔ یہ تمھاری عزت کا سوال ہے۔ پھر یہ مت کہنا کہ ہم نے پانچ وقت کی نماز پڑھنا کیوں چھوڑ دی – ہاں....۔''

تبھی نواب صاحب کے سر پر ایک بورا پڑا۔ اور وہ غش کھا کر وہیں ڈھیر ہو گئے۔ جب آنکھیں کھلیں تو کیا دیکھا! بورے میں سَو سَو روپے کے نوٹوں کے سَو بنڈل تھے۔ پورے لاکھ روپے!

وہ چلا اٹھے، ''اری سنتی ہو، بیگم!''

بیگم کچن میں تھی۔ بولی، ''کیا ہے، جی؟ صبح صبح کیوں گلا پھاڑے جا رہے ہو؟''

نواب صاحب نے اور زور لگا کر کہا، ''جیتے گا، بھئی جیتے گا!''

بیگم رنگیلی نے آکر ماجرا دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ نواب صاحب بنڈل سے نوٹ الگ کر کمرے میں اِدھر اُدھر اڑا رہے تھے، نعرے لگا رہے تھے۔

جیتے گا بھئی جیتے گا

جنگ بہادر جیتے گا

چٹکلا خدا کا

بیگم سوچ نہ سکی کہ یہ کرامت ہوئی کیسے؟ کبھی وہ چھپّر کی طرف دیکھتی تو کبھی روپوں کی طرف۔ البتہ چھپّر ٹوٹا ہوا تھا۔ لیکن وہ تو نواب صاحب نے خود تڑوایا تھا تا کہ خدا کو یہ زحمت اٹھانی نہ پڑے۔

''ارے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہو؟'' نواب صاحب نے فخر سے کہا، ''پورا لاکھ روپیہ ہے۔ نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔ آخر اللہ میاں کو ہم نے نوٹس جو دیا تھا!''

''میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔''

''اس میں سمجھنے کی بات ہی کیا ہے؟'' نواب صاحب نے بتایا، ''اس کل یُگ میں اللہ میاں کا صرف ایک ہی سچا دوست بچا ہے، سو ہیں ہم۔ اگر ہم ناراض ہو جائیں تو پھر اُسے کون یاد کرے گا؟ کون اس کی بندگی کرے گا؟ کون اسے پروردگار کہہ کر پکارے گا؟ یہ بات اسے چبھ گئی اور اسی وجہ سے اس نے ہمیں لاکھ روپے دے دیے۔ اب تیاری شروع کر دو۔''

بیگم چونکی، ''کاہے کی؟''

''چناؤ لڑنے کی۔''

''لیکن مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''یہ دیگ بھر کر حلوہ پوری بنانا ہوگا۔''

''ہیں...!''

سارے گاؤں کو ہم چناؤ کے دن حلوہ پوری کھلائیں گے۔'' نواب صاحب فٹافٹ کہے جا رہے تھے، ''اور ہاں، حلوے میں بادام، پستے کے ساتھ اصلی گھی اور اچھی زعفران بھی ہونا چاہیے۔ سمجھی؟''

بیگم رنگیلی ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی اور نواب صاحب باہر دوڑ گئے۔ چناؤ پر چار شروع کرنے سے پہلے شیر سنگھ اور کلّو کلہاڑی سے صلاح مشورہ کرنا ضروری تھا۔ شیر سنگھ کھیت پر گیا ہوا تھا۔ اس سے ملاقات نہ ہوسکی۔ لیکن کلو کلہاڑی قبرستان میں مل گیا۔ اس نے درجن بھر قبریں کھود کر تیار رکھی تھیں۔ خود ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر چلم پھونک رہا تھا۔ جیسے ہی نواب صاحب پر نظر پڑی، وہ بول اٹھا، ''چن لو۔''

''کیا؟''

''کوئی بھی ایک قبر۔''

''اماں، ہم تو ابھی زندہ ہیں۔''

''اسی لیے تو آپ کو چننے کا موقع مل رہا ہے۔'' کلّو کلہاڑی نے چلم کا ایک اور کش لیتے ہوئے کہا، ''یہ گل موہر کے درخت کے نیچے والی جگہ کیسی رہے گی؟''

''اماں، ہمیں ابھی جلدی نہیں ہے۔''

''جلدی تو کسی کو بھی نہیں۔ لیکن چناؤ کے اس موسم میں سارے کام تیزی سے ہوتے ہیں۔ موت بھی تیزی سے آتی ہے۔ تیزی سے پانچ دس لاشیں اِدھر اُدھر گر جاتی ہیں۔ ہوسکتا ہے ان میں سے ایک آپ کی ہو۔''

''ایں!'' نواب صاحب جھینپ گئے۔ پھر پوچھا، ''لیکن چناؤ کے ساتھ موت کا کیا جوڑ؟''

''یہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔''

''تب ہم چناؤ کیسے لڑیں گے؟''

''کیا آپ بھی چناوی جنگ میں کود رہے ہیں؟''

''اللہ کی ایسی ہی مرضی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب صاف ہے۔'' نواب صاحب نے بتایا، ''اللہ میاں نے ہمارے چناؤ فنڈ میں ایک لاکھ روپے دیے ہیں۔''

''ایں...''

''اب پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری پارٹی کا نشان کیا ہو؟''

کلّو کلہاڑی چلم کو بھول کر سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ پل کسی شاعر کی طرح سنجیدگی سے سوچتا رہا۔ پھر اچانک چٹکی بجاتے ہوئے وہ بولا،''مل گیا۔''

''کیا؟''

''ہماری پارٹی کا نشان۔''

''کیا؟''

''مُردہ۔''

''ایں!''

''مردہ۔''

''اماں، یہ بھی کوئی نشان ہوا!''

''اور کیا!'' کلّو کلہاڑی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ کہا،''یہی ایک نشان ایسا ہے جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی کو اپنا پن محسوس ہوتا ہے۔ اور یہ مت بھولو میاں کہ مردہ سبھی کو پیارا ہوتا ہے۔ اسی لیے تو لوگ باگ مردے پر آنسو بہاتے ہیں۔ یاد ہے جب آپ کی موت کی افواہ پھیلی تھی تو سارا گاؤں بلک بلک کر کیسے رویا تھا؟''

نواب صاحب کے گلے سے دلیل نہ اتری،''وہ سب ٹھیک ہے،''انھوں نے کہا،''لیکن مردہ...!''

کلّو کلہاڑی بیچ میں ہی نعرہ بلند کر اٹھا،''جیتے گا بھئی جیتے گا مردے والا جیتے گا!'' اور ایک پکی قبر پر چڑھ کر کلہاڑی کے ساتھ ناچنے لگا۔

شیر سنگھ جو نواب صاحب کا پیغام پا کر ابھی ابھی قبرستان میں آیا تھا، حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا،''آخر بات کیا ہے، نواب صاحب؟ یہ مردے والا کون پیدا ہو گیا؟''

نواب صاحب نے اسے ساری بات بتائی تو کلّو کلہاڑی پکی قبر پر سے کود کر شیر سنگھ کے سامنے

آ گیا۔

''شیرا، سچ سچ بتانا،'' وہ بولا، ''آخر ایک دن تو سبھی کو مردہ بننا ہے یا نہیں؟''

''بالکل سچ۔'' شیر سنگھ نے خالی قبروں پر نظریں پھیرتے ہوئے کہا،''اور درجن بھر کو تو اسی موسم میں بننا ہے۔''

''تب بتاؤ کہ نشان مردہ میں کیا خرابی ہے؟''

''یہی کہ مردہ بننا کوئی پسند نہیں کرتا۔ ننانوے سال کا بڈھا بھی نہیں چاہے گا کہ ان کی سانس رک جائے۔'' شیر سنگھ کہہ رہا تھا، دوسرے ایسے فضول نشان اگر ہمارے نواب صاحب چنتے تو ان کی جگ ہنسائی اور ناک کٹ جائے سو الگ۔''

''ناک!'' نواب صاحب اچانک بول اٹھے۔

''ابھی سے کٹ گئی؟'' کلّو کلہاڑی نے مذاق میں پوچھا۔

''نہیں،'' وہ بولے،''ہمارا نشان، ن ن ن ن ناک...''

''ناک۔'' شیر سنگھ بولا۔

''نگاڑاپور کی ناک،'' نواب صاحب نے سینہ تان کر کہا،''دیش کی ناک۔ ایتابھ بچن کی ناک، بولی وُڈ کی ناک۔ دیش کی ناک۔ دلّی کی ناک۔ سب کی پیاری، سب کی چہیتی ناک۔''

پھر دونوں ایک ساتھ، ایک آواز میں بول اٹھے۔

جیتے گا بھئی جیتے،

ناک والا جیتے گا۔

جب جوتے والے اور ٹانگ والے دَل نے گلی گلی چپکے ناک کے پوسٹر دیکھے تو ان کے خیموں میں سناٹا چھا گیا۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ پنڈت ماکھن لال صرف ہندوؤں کے بل پر چناؤ لڑ رہے تھے۔ مولوی علی ولی کو صرف مسلمانوں کے ووٹوں کی امید تھی۔ جبکہ نواب رنگیلے ہندو مسلمان سبھی کے پیارے تھے۔

مولوی صاحب نے اسی رات اپنے گروہ کے سارے پہلوانوں کو اکٹھا کر کے ان کے آگے مسئلہ

پیش کیا، ''کافی تعداد میں ہمارے ووٹ ٹوٹیں گے اس میں کوئی شک نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟ ہم کیسے اپنے قلعے کو سلامت رکھیں؟''

''سوال یہ بھی ہے کہ دشمن کے قلعے کو نیست و نابود کیسے کیا جائے؟'' غضب علی نے کہا۔

''اور سوال یہ بھی ہے کہ... '' دوسرے پہلوان نے جوڑا، ''اس وقت ہمارا دشمن ہے کون؟ پنڈت ماکھن لال یا نواب رنگیلے؟''

''دشمن نمبر ون... '' مولوی صاحب نے دانت کٹکٹا کر کہا، ''نواب کا بچّہ! اس کا قلعہ ایسا ٹھوس ہے کہ سو ہاتھی مل کر بھی اس کی ایک اینٹ تک ہلا نہیں سکتے۔ بہتر یہی ہے کہ اپنے ووٹ کی سلامتی کے لیے پوری طاقت لڑا دیں۔''

اِدھر ہنومان اکھاڑے کی دیواریں بھی تھرّا اٹھی تھیں۔ پنڈت ماکھن لال کا بھی دشمن نمبر ایک نواب رنگیلے تھے۔ لیکن چناؤ کے میدان میں ان کا ایک بال بھی بانکا کرنا کسی کے بوتے کی بات نہیں تھی۔ تب کیا کیا جائے، نئے ووٹ کہاں سے، کیسے پیدا کیے جائیں؟

گہرائی سے سوچنے پر انھیں خیال آیا۔ نگاڑاپور میں جو مِل تھی اس کے سارے مزدور ہریجن تھے۔ اِن ہریجنوں کے سارے ووٹ اس دَل کو ملتے تھے جس دَل پر ہریجنوں کے مکھیا کی مہربانی ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے سبھی دَل والے ہریجنوں کے مکھیا کو پٹانے کے فراق میں رہتے تھے۔

پنڈت ماکھن لال نے طے کر لیا۔ چاہے دھرم ہی کیوں نہ بھرشٹ کرنا پڑے، اب کی ہریجنوں کے سارے ووٹ کسی بھی قیمت پر ہتھیانے ہوں گے۔ تبھی مانو ایک معجزہ ہوا۔ ہریجنوں کا مکھیا ہنومان اکھاڑے کے دروازے پر کھڑا تھا۔

ویسے تو پنڈت کو وہ آنکھوں نہیں بھاتا تھا، لیکن چناؤ کے دنوں میں سارے رشتے بدل جاتے ہیں۔ گدھا باپ بن جاتا ہے اور چوہا ہاتھی کو دیدے دکھاتا ہے۔

پنڈت ماکھن لال نے لپک کر اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ''میں تو خود تم سے ملنے کی سوچ رہا تھا۔''

''کیوں؟''

''کہیں مولوی صاحب کے چکّر میں پڑ کر تم لوگ بہک نہ جاؤ۔ یہ سمجھانے آنے والا تھا۔ سنا ہے، سسُرے آج کل ہریجنوں کا دھرم ہی بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ لیکن مجھے بھروسہ ہے کہ تم لوگ ان کے جھانسے میں نہیں آؤ گے۔''

''اگر آپ ہماری مدد کریں تو ہم کسی کے چکر میں نہیں پھنسیں گے۔''

''آخر انسان انسان کے کام نہیں آئے گا تو کون آئے گا؟'' پنڈت جی نے جوڑا، ''کہو، کتنے ہزار لو گے؟''

''ہمیں مال نہیں چاہیے؟''

پنڈت جی نے سوچا، مکھیا ہے پکّی مٹّی کا گھڑا۔ قیمت بڑھانی ہوگی، ''پچاس ہزار نقد اور دلّی کا سفر، وہ بھی ہوائی جہاز سے۔''

اب مکھیا اصلی بات پر آیا۔ مِل کے سارے مزدور کل سے ہڑتال پر اترنے والے تھے۔ ہریجنوں کا مکھیا چاہتا تھا کہ پنڈت جی کا دَل مزدوروں کا ساتھ دے۔

پنڈت پر مانو بجلی ٹوٹ پڑی۔ وجہ یہ تھی کہ چناؤ لڑنے کے لیے لاکھوں روپے انھیں مِل مالک کی طرف سے ملتے تھے۔ اگر وہ مزدوروں کا ساتھ دیں تو اس کا بیڑا ہی غرق نہ ہو جائے۔

ہریجنوں کا مکھیا وہاں سے نکل کر غضب علی کے اکھاڑے میں پہنچا تو مولوی صاحب اچھل پڑے۔ جیسے ان کے جنّت نشین ابّا حضور قبر سے اٹھ کر ان سے ملنے آئے ہوں ایسے باری باری مکھیا سے تین بار گلے ملے۔ پھر کہا، ''مجھے تم سے یہی امید تھی۔''

''کیا امید تھی؟''

''وہ سسُرا پنڈت، جو تمھیں مندر میں گھسنے نہیں دیتا، کنوئیں سے ایک بوند پانی تک لینے نہیں دیتا، ان کا ساتھ تم لوگ دے ہی نہیں سکتے۔'' پھر مولوی صاحب نے دھیرے سے پوچھا، ''کتنے لو گے؟ پانچ ہزار؟ پچیس ہزار؟ پچاس؟ لاکھ روپیہ نقد اور آگرے کا سفر گاڑی میں۔ بعد میں گاڑی بھی تمھاری۔''

ہریجنوں کے مکھیا نے اپنی پریشانی ان کے آگے رکھی اور ان کے گروہ کا ساتھ چاہا۔ مولوی صاحب کا ماتھا بھی بھنّا گیا۔ انھیں بھی چناؤ لڑنے کے لیے لاکھوں روپے مِل مالک کی طرف سے ملتے تھے اور مولوی صاحب قطعی اتنے بے وقوف نہیں تھے کہ اپنے پیروں پر اپنے ہی ہاتھوں سے کلہاڑی ماریں۔

چونکہ نواب رنگیلے کو چناؤ فنڈ کے لیے روپیہ خدا سے ملا تھا، وہ خدا کے سوا کسی سے ڈرتے نہیں تھے۔ جب ہریجنوں کا مکھیا ان کے گھر پہنچا تو انھوں نے ساری بات غور سے سنی اور فوراً فیصلہ بھی سنا دیا، ''ہم، ہمارا دَل اور ہمارے اللہ میاں مزدوروں کے ساتھ ہیں۔ جب تک مزدوروں کو انصاف نہیں ملے گا، ہڑتال جاری رہے گی۔''

''وہ تو ٹھیک،'' ہریجنوں کا مکھیا بولا، ''لیکن مزدوروں کے راشن کا کیا؟''

''جتنے دن ہڑتال چلے گی،'' نواب صاحب سینہ چوڑا کر بول اٹھے، ''اتنے دن مزدوروں کی ناک ہماری ہی تو ناک ہے۔''

ہریجنوں کا مکھیا خوش ہو گیا۔

مولوی علی ولی اور بھی دکھی ہو گئے۔ جب انھیں پتہ چلا کہ ہریجن مزدوروں کے سارے کے سارے ووٹ ناک والے نواب رنگیلے کو ملنے والے ہیں تو انھیں لگا کہ ان کی ایک ٹانگ جو ہمیشہ اونچی رہتی تھی، کسی نے کھینچ کر سیدھی کر دی ہے۔ مونچھیں نیچی کر دی ہیں۔ داڑھی کے بال نوچ نوچ کر ہوا میں بکھیر دیے ہیں۔ اور ناک۔

''کیا بات ہے مولانا؟'' پنڈت ماکھن لال نے اپنے مکان کی کھڑکی سے مولوی علی ولی کا پل پل رنگ بدلتا ہوا چہرہ دیکھ کر پوچھا، ''آپ کی ناک آج کچھ چھوٹی کیوں نظر آ رہی ہے؟''

''چھوٹی ہی سہی، لیکن ہے تو سہی۔'' مولوی صاحب نے اپنے مکان کی کھڑکی سے منہ توڑ جواب دیا، ''آپ کی ناک تو ہمیں دکھائی ہی نہیں دیتی۔''

''اگر آپ کا جوتا ہماری ٹانگ میں فٹ ہو جائے تو بالکل نظر آئے گی۔''

مولوی صاحب کی آنکھیں تھوڑی چوڑی ہوئیں۔ پنڈت جی نے دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی طرف

اشارہ کیا تھا۔ سیاست کا دوسرا سبق یہی کہتا ہے- جب دو دشمنوں کا دشمن ایک ہو تو دونوں دشمنوں کو دوست بن جانا چاہیے، تاکہ دوگنی طاقت سے نئی مصیبت کا مقابلہ کیا جا سکے۔

مولوی صاحب نے فوراً فیصلہ لیتے ہوئے کہا، ''پنڈت جی! ہم نے جوتا ہی ایسا بنایا ہے کہ آپ کی ٹانگ تو کیا، کسی کے بھی پیر میں فٹ ہو جائے۔''

پنڈت ماکھن لال اور مولوی علی ولی، کل کے جانی دشمن آج جگری دوست بن گئے۔ دونوں نے مل کر چناوی جنگ کے پینترے طے کر لیے۔ کسی بھی قیمت پر نواب رنگیلے کو بدنام کرنے کی ضرورت تھی، تاکہ ان کی مقبولیت میں کمی آئے اور ان کو ملنے والے ووٹ ٹوٹیں۔

اس گندے کام کے لیے طیب علی بوری کو چنا گیا۔ طیب علی بوری نواب رنگیلے کا جانی دشمن تھا۔ دشمنی کی وجہ صرف اتنی تھی کہ لوگ باگ نواب رنگیلے کی تعریف کرتے تھے اور اسے کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ نواب رنگیلے کی شہرت سے وہ ایسے جلتا تھا جیسے چولھے میں گیلی لکڑی جلتی ہے۔ نواب صاحب کا نام سن کر وہ ایسے غرّاتا ہے، جیسے کتّا بلّی کو دیکھ کر غرّاتا ہے۔ پھر کہتا، ''ایک دن ٹیرے کو دیکھ لوں گا۔''

یہاں شیر سنگھ اور کلّو کلہاڑی نے نواب رنگیلے کے چناؤ پرچار کا سارا کام سنبھال لیا تھا، کوئی گلی، کوئی محلّہ، کوئی چوراہا ایسا نہیں تھا جہاں ناک کا پوسٹر چپکا نہ ہو۔ بلکہ جیسے جیسے چناؤ کا دن قریب آ رہا تھا، نواب رنگیلے کے دَل کے پوسٹر ہندوستان کے عوام کی طرح بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اب تو ناک کے بینر بھی مکانوں اور حویلیوں پر نظر آنے لگے تھے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں- چناؤ کے ایک ہفتے پہلے کے دن پوسٹر جنگ کے دن ہوتے ہیں۔ صبح جہاں جہاں ٹانگ کے پوسٹر نظر آتے، شام وہیں جوتے کے پوسٹر چمک اٹھتے اور رات میں مِل مزدور ان پر ناک کے پوسٹر چپکا آتے۔ (ہڑتال کامیاب رہی تھی اور اسی وجہ سے سارے مزدور نواب صاحب کے دَل میں کود پڑے تھے۔)

سبھی دَلوں کی جیپیں بھونپوؤں کے ساتھ دن رات گھوم رہی تھی۔ آوازوں کے مربّے نے لوگوں کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔

آوازیں بھونپوؤں کی۔
آوازیں نعروں کی۔
آوازیں تقریروں کی۔

''میرے پیارے نگاڑاپور کے باشندو!'' نواب رنگیلے اسٹیج پر سے کہہ رہے تھے، ''کیا آپ جانتے ہیں کہ چناؤ لڑنا ہم نے کیوں طے کیا ہے؟''

سبھی بول اٹھے، ''نہیں۔''

نواب صاحب نے آگے کہا، ''اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ میاں چاہتے ہیں کہ ہم چناؤ لڑیں۔ دوسری یہ کہ ہم چاہتے ہیں کہ نگاڑاپور کے ہر بچّے کو روزانہ ایک ایک ملائی قلفی کھانے کو ملے۔''

نواب صاحب کے مجمعے میں آدھے سے زیادہ بچّے ہی تھے۔ ملائی قلفی جیسے میٹھے لفظ سن کر وہ تالیاں بجا اٹھے۔

''نگاڑاپور کے ہر جوان کو روزانہ فائیو اسٹار طعام کھانے کو ملے۔''

اب کی جوانوں نے زوردار تالیاں بجائیں۔

''اور نگاڑاپور کے ہر بوڑھے کو دن میں دو بار ربڑی ملے!''

ننانوے سال کے بوڑھے کے ساتھ باقی بزرگ لوگ تالیاں بجا اٹھے۔

''شاید آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ سب آئے گا کہاں سے؟'' نواب صاحب نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا، ''تو اس کا جواب بھی حاضر ہے۔ یہ سب آئے گا ہماری محنت سے۔ ہم سب ساتھ مل کر محنت کریں گے اور نگاڑاپور کے ساتھ اس دیش کو بھی آگے بڑھائیں گے۔''

نواب صاحب نے ابھی اپنی تقریر ختم نہیں کی تھی کہ اسی اسٹیج پر کہیں سے طیب علی بوری دھنس آیا۔ اس کے ساتھ ایک بھونپو تھا۔ اسی بھونپو سے چلا کر وہ بولا، ''یہ نواب سب جھوٹ بولتا ہے۔''

یہ سننا تھا کہ مجمعے میں اکٹھا لوگوں نے طیب علی بوری پر سڑے گلے انڈے پھینکے۔ آلو ٹماٹر پھینکے۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ بلکہ آگے کہا، ''اس رنگیلے کی رنگیلی باتوں میں ٹم مٹ پھنسنا۔ یہ ٹو

پاکستان کا جاسوس ہے۔''

اب کی کچھ لوگ چونکے۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ نواب رنگیلے جیسا دیش بھگت کیا نگاڑا پور سے غدّاری کرسکتا ہے؟ کسی نے مجمعے سے کھڑے ہوکر سوال اچھالا، ''کیا تمھارے پاس کوئی ثبوت ہے کہ نواب صاحب پاکستانی جاسوس ہیں؟''

بس! بازی طیب علی بوری کے ہاتھ میں جا پہنچی۔ اسے اسی پل کا انتظار تھا کہ کوئی اس سے ثبوت مانگے۔ اس نے جواب میں کہا، ''طبلا گنج والا دہاڑ علی اس کا دوست ہے یا نہیں؟ انڈے خریدنے کے

بہانے دہاڑعلی نگاڑاپور کے راز لینے اس کے گھر آتا جاتا ہے یا نہیں؟''

پھر اس نے بتایا کہ حقیقت میں نواب صاحب انڈوں میں چھید کر اندر سے زردی اور سفیدی نکال لیتے ہیں اور خالی انڈوں میں خفیہ خط رکھ دیتے ہیں۔ دہاڑعلی وہی چٹھی والے انڈے لے کر سرحد پر لوٹ جاتا ہے۔

''آپ معزز لوگ پھر پوچھیں گے کہ ثبوت؟'' طیب علی بوری لگاتار بولے جا رہا تھا، ''تو لو، یہ رہا ثبوت!'' اس نے ایک انڈا جیب سے نکالا اور بھیڑ برابر دیکھ سکے، ایسے ہاتھ اوپر اٹھایا، ''یہ انڈا میں نے اپنے پیارے نواب صاحب کے گھر سے کل رات میں برآمد کیا تھا۔ اس میں ایک پیغام بھی ہے۔ میں یہ انڈا پنچوں کو سونپتا ہوں۔ اب پنچ مائی باپ ہی فیصلہ کریں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کریں۔''

مجمعہ حلوہ پوری بھول گیا۔ پھر سڑے ہوئے انڈے اڑے۔ آلو اور ٹماٹر اڑے۔ لیکن اب کے نشانہ بدل گیا تھا۔ نواب رنگیلے کے پیر ڈگمگا اٹھے۔ پھر بھی وہ سینہ تان کر اسٹیج پر کھڑے تھے۔ مردِ میداں کی طرح سڑے گلے انڈوں اور سبزی کی بمباری جھیل رہے تھے۔

مجمعے میں سب سے پیچھے کھڑے ہوئے پنڈت ماکھن لال اور مولوی علی ولی نے من ہی من مسکراتے ہوئے چپ چاپ ایک دوسرے کی پیٹھ تھپتھپائی۔ ان کی میلی چال قریب قریب کامیاب رہی تھی۔

ایک فاصلے پر کھڑے شیر سنگھ نے دیکھا اور وہ سمجھ گیا۔ چال معمولی نہیں تھی۔ گہری تھی۔ اس نے اپنے دماغ پر زور دیا۔ دشمن کی چال کو ناکام بنانے کے لیے اس نے ایک نئی چال سوچی۔ پھر وہ کچھ منٹوں کے لیے غائب ہو گیا۔

یہاں پنچوں کے مکھیا نے انڈا توڑ کر خط نکالا۔ خط میں پیغام لکھا تھا۔ ''پیارے دہاڑعلی، چناؤ لڑنے کے لیے لاکھ روپیہ کم پڑے گا۔ ڈیڑھ لاکھ اور بھیجو۔''

مکھیا کی آنکھیں چوڑی ہو گئیں۔ انھیں چوڑی آنکھوں سے انھوں نے نواب رنگیلے کی طرف دیکھا۔ سچ کا سینہ ہمیشہ چوڑا ہوتا ہے۔ نواب صاحب کا سینہ بھی چوڑا تھا۔ طیب علی بوری کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ لیکن وہ ہنسی شیر کی نہیں، گیدڑ کی تھی۔

مکھیا نے اسٹیج کے باقی ممبروں کو پیغام پڑھنے کے لیے دیتے ہوئے تحقیقات شروع کی، ''نواب صاحب!''

''فرمائیے۔''

''ہم جو کچھ بھی پوچھیں گے اس کا جواب آپ سچ دیں گے اور سچ کے سوا اور کچھ نہیں کہیں گے۔''

''بالکل سچ!'' نواب صاحب بولے۔

''تب یہ بتاؤ کہ چناؤ لڑنے کے لیے آپ کے پاس ایک لاکھ روپیہ کہاں سے آیا؟'' مکھیا نے پہلا سوال داغا۔

''ہمیں اللہ میاں نے دیا۔''

''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کی پارٹی کو اللہ میاں چناؤ فنڈ دیتے ہیں؟''

''چھپّر پھاڑ کر دیتے ہیں۔'' نواب صاحب بول اٹھے، ''لیکن سچ یہ ہے کہ چھپّر کلّو کلہاڑی پھاڑتا ہے اور روپیہ اللہ میاں دیتے ہیں۔''

پنچوں نے ایک دوسرے کے منہ دیکھے۔ اسٹیج پر بندوقی لال بھی تھا۔ پیغام دیکھ کر وہ چکمہ کھا گیا تھا۔ اب اس نے نواب صاحب کی اول جلول صفائی سنی تو اس کا ڈنڈے والا ہاتھ بے چین ہو اٹھا۔ بھلا اس صدی میں کرامات کی ایسی بے تکی باتیں کون مان سکتا ہے؟

''سچ سچ بتاؤ، میاں!'' نواب صاحب کی طرف مڑتے ہوئے وہ غرّایا، ''ورنہ آپ کی دھنائی یہیں، آپ کے ووٹروں کے سامنے ہو جائے گی! ہاں...''

''ہم خدا کے نیک بندے ہیں،'' نواب صاحب نے ہمت سے کہا، ''ہم صرف خدا کے ڈنڈے سے ڈرتے ہیں، کسی اور ڈنڈے سے نہیں۔ تم بھی خدا کے ڈنڈے سے ڈرو۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ہم سچّے ہیں اور تم...''

''جھوٹ۔'' کوئی چلاّیا۔

اسٹیج پر سے سبھی نے مجمعے کی طرف دیکھا تو شیر سنگھ بھیڑ کو چیرتا ہوا آ رہا تھا۔ اتنا ہی نہیں، زور زور سے

چلاّ بھی رہا تھا، ''نواب صاحب جھوٹے ہیں! مکّار ہیں! فریبی ہیں! دھوکے باز ہیں! غدّار ہیں۔''

''ایں...!'' اب کے نواب صاحب کی کھوپڑی گھومنے لگی۔ دن دہاڑے ستارے دکھائی دینے لگے۔ پنچوں کی حیرانی کی انتہا نہیں تھی۔ مجمعے میں سب سے پیچھے کھڑے پنڈت ماکھن لال اور مولوی علی ولی بھی چکرا گئے۔

شیر سنگھ نواب صاحب کا بچپن کا ساتھی، نواب صاحب کی پارٹی کا مشتہر وزیر کہہ رہا تھا کہ اس کا لیڈر جھوٹا ہے۔ نواب صاحب پر تو آسمان ہی ٹوٹ پڑا۔
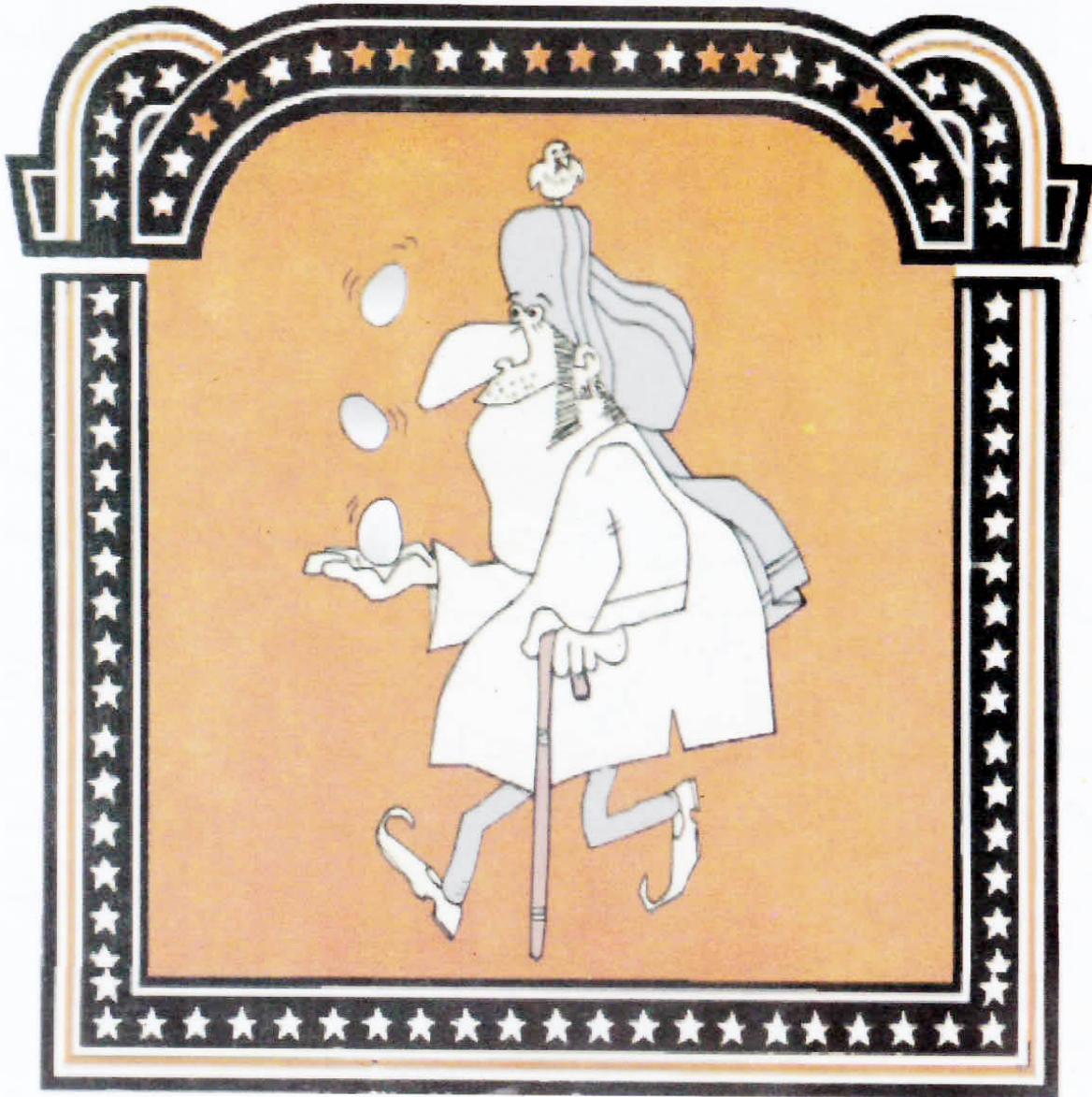
اب شیر سنگھ اسٹیج پر آیا تو پنچوں کے مکھیا نے اُسے ڈانٹا، ''تم ہوش میں تو ہو، نا؟ تمھیں پتہ ہے، تم کیا کہہ رہے ہو!''

''میں نہیں کہتا،'' شیر سنگھ نے اپنی پگڑی میں حفاظت سے رکھے تین انڈے نکالتے ہوئے جواب دیا، ''یہ انڈے کہتے ہیں۔ ہم نے ابھی ابھی یہ انڈے نواب صاحب کے گھر سے برآمد کیے ہیں۔''

مجمعے میں پھر ہو ہلّا بڑھ گیا۔ نواب رنگیلے پر لوگ لعنتیں برسانے لگے۔ ان کے پرکھوں کی کھال ادھیڑنے لگے۔ پنچوں کے مکھیا نے سبھی کو خاموش کرتے ہوئے تین نئے انڈوں میں سے ایک کو توڑا۔ اس میں سے جو پیغام نکلا، وہ سبھی سن سکیں ایسے بآوازِ بلند پڑھ کر سنایا۔

اس میں لکھا تھا- ''پیارے دہاڑ علی، ہمیں ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ مولوی علی ولی امریکہ کے پالتو کتّے ہیں۔ چناؤ لڑنے کے لیے انھیں امریکی ڈالر بھی ملتے ہیں۔''

سبھی کے ساتھ مولوی صاحب نے یہ سنا تو ان کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ لیکن کسی طرح اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے وہ چلا اٹھے، ''جھوٹ۔''

جواب شیر سنگھ نے دیا۔ اسٹیج پر سے اس نے کہا، ''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک انڈا سچ اور دوسرا انڈا جھوٹ؟''

مولوی صاحب خاموش ہو گئے۔

پنچوں کے مکھیا نے دوسرا انڈا پھوڑا۔ اس میں سے جو پیغام نکلا وہ اس طرح تھا- ''پیارے دہاڑ علی، پنڈت ماکھن لال روس سے رشوت لینا بند نہیں کریں گے۔ بلکہ اب تو پنڈت جی روس سے بم گولے بھی چاہتے ہیں۔''

پنڈت جی ایسے ہل گئے کہ ان کی زبان سیدھی پیٹ میں اتر گئی۔ وہ ایک لفظ بھی بول نہیں سکے۔

تیسری باری طیب علی بوری کی تھی۔ کیونکہ تیسرے انڈے میں اسی کے بارے میں پیغام تھا۔ لکھا تھا- ''پیارے دہاڑ علی، کسی طرح بھی طیب علی بوری چناؤ میں کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ بہت ہی جلد چندے کے لیے وہ تمھارے پاس آئے گا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر وہ چناؤ جیت گیا تو نگاڑاپور کو طبلا گنج میں شامل کرنے

میں وہ تمھاری مدد کرے گا۔''

یہ سنا تھا کہ مجمعہ قابو سے باہر ہو گیا۔ کچھ لوگ طوفان کی طرح اسٹیج پر چڑھ آئے اور طیب علی بوری کو آندھی کی طرح گھسیٹ کر بھیڑ میں لے گئے۔ پھر اس کی ایسی دھنائی کی کہ اسے نانی یاد آ گئی۔ اگر تھانے دار بندوقی لال پوری ہمت کے ساتھ بھیڑ پر کود کر اسے بچا نہ لیتا تو اب تک وہ اپنی نانی پاس پہنچ گیا ہوتا۔

اب دھنائی کی باری نواب صاحب کی تھی۔ کیونکہ ساری مصیبتوں کی جڑ وہی تھے۔ بھیڑ سے کچھ سر پھرے لوگ پھر اسٹیج کی طرف لپکے، تو تھانے دار نے پٹّے سے نکال کر بندوق تان دی، ''ٹھہرو!''

سر پھرے لوگ رُک گئے۔

''ان پھوٹے انڈوں سے مجھے گھوٹالے کی بُو آ رہی ہے۔''

''کیسا گھوٹالا؟'' پنچوں کے مکھیا نے اس سے پوچھا۔

''یہ چار پیغام، جو چار انڈوں سے نکلے ہیں، آپ کے سامنے ہیں۔'' بندوقی لال اب تھانے دار سے جاسوس بن گیا تھا اور ہندوستان کے ایک تجربہ کار جاسوس کی ادا سے کہے جا رہا تھا، ''ان میں ایک پیغام کے دستخط بقیہ تین خطوں سے الگ ہیں۔ اس سے تو یہ تو صاف ظاہر ہے کہ یہ سارے خط نواب صاحب نے نہیں لکھے۔''

نواب صاحب جو من ہی من بدبدا رہے تھے۔ جل تُو جلال تُو، آئی بلا کو ٹال تو۔ تھوڑے سنبھل گئے۔ پھر بولے، ''اماں، ہم نے تو ایک بھی خط نہیں لکھا۔''

''تب کس نے لکھے؟''

''یہ تو طیب علی بوری ہی بتا سکتا ہے۔''

تھانے دار نے ادھ مرے سے طیب علی بوری کو گردن سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ پھر اسی کے لہجے میں پوچھا، ''بیٹا سچ سچ بتا، یہ پیغام کس نے لکھے ہیں؟''

اس نے اپنا قصور قبول کر لیا۔ ایک خط اسی نے لکھا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مولوی علی ولی اور پنڈت ماکھن لال نے اس سے مل کر یہ سازش کی تھی۔ وہ دونوں نیتا لوگ نواب صاحب کو بدنام کرنا چاہتے

تھے تاکہ نواب صاحب کے ووٹ ٹوٹے اور جیت ان دونوں میں سے ہی کسی ایک کی ہو۔

مولوی صاحب اور پنڈت جی بھیڑ سے کب کے غائب ہو چکے تھے۔ اگر اس وقت وہ دونوں یہاں موجود ہوتے تو ان دونوں کی عوام ایسی دھنائی کرتی کہ طیب علی بوری اپنے کو خوش قسمت سمجھتا۔

اب اسٹیج پر یہ سوال کھڑا ہوا کہ باقی تین خط کس نے لکھے؟

شیر سنگھ کو لگا، یہی موقع ہے راز کا پردہ فاش کرنے کا! وہ مکھیا کے سامنے آیا اور کہا، ''دراصل بات یہ ہے کہ دشمنوں کی چال کو ناکام کرنے کے لیے باقی تین انڈے میں نے تیار کیے اور باقی تین پیغام بھی میں نے لکھے تھے۔''

دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی صاف ہو گیا۔ نگاڑا پور کے باشندوں کو آخر پتہ چل ہی گیا کہ کون غدّار ہیں اور کون ان کا صحیح لیڈر رہے۔ پھر بات کیا تھی! مجمع میں اکٹھا سبھی لوگ ایک ساتھ، ایک آواز میں نعرہ بلند کر اٹھے۔

جیتے گا بھئی جیتے گا

ناک والا جیتے گا۔

نواب صاحب نے چناؤ کے دن نگاڑا پور کے سبھی بچّوں کو ملائی قلفی، سبھی جوانوں کو فائیو اسٹار طعام اور سبھی بزرگوں کو ربڑی کھلائی۔ نتیجہ یہ آیا کہ لوگوں نے جم کر ووٹ کیا۔

اس چناؤ میں پنڈت ماکھن لال کو دو ووٹ ملے۔ جس میں سے ایک ان کا اپنا اور دوسرا ان کی بیوی کا تھا۔ مولوی علی ولی کو تو صرف ایک ہی ووٹ ملا۔ کیونکہ ان کی بیوی پاگل تھی اور ووٹ ڈالنے کے لیے دماغ کے سبھی پُرزوں کا صحیح جگہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔

جب دہاڑ علی کو نواب رنگیلے کی زبردست جیت کا پتہ چلا تو دوست کے ناتے طبلا گنج کے پیڑوں کے ایک ڈبّے کے ساتھ وہ گلاب کے سَو پھولوں کی موٹی سی مالا لے کر صبح صبح آ پہنچا۔

''اماں، نواب صاحب!'' باہر سے وہ دہاڑا، ''اگر مِل کے بھونپو سے آپ کی نیند ٹوٹی نہ ہو تو میں دوبارہ دہاڑوں۔''

''بس بس دہاڑعلی!'' نواب صاحب دروازہ کھولتے ہوئے بولے، ''آپ کی ایک دہاڑ قبرستان کے سارے مردوں کو جگانے کے لیے کافی ہے۔''

سب سے پہلے اس نے نواب صاحب کے گلے میں گلاب کے پھولوں کی مالا ڈالی۔ پھر باری باری تین بار گلے مل کر پیڑوں کا ڈبّہ بھی پیش کیا۔

''میاں اس کی کیا ضرورت تھی؟''

''اماں، کوئی معمولی بات تھوڑے ہی ہے!'' وہ پھر دہاڑا، ''خدا کے نیک بندے کی فتح ہوئی ہے۔''

''سوتو سچ ہے۔''

''تب تو آپ خدا کے ہر حکم پر عمل کریں گے ہی۔''

''اس میں کیا شک ہے؟ آج تک کرتے آئے ہیں۔''

''تو...'' کچھ کہتے ہوئے دہاڑعلی نے پل بھر سوچا۔

''بولو، بولو! یہاں عوامی راج ہے۔ بولنے پر کوئی روک نہیں۔''

دہاڑعلی نے آخر کہہ ہی ڈالا، ''آپ کو چناؤ لڑنے کے لیے خدا نے لاکھ روپے دیے تھے تب کیا کہا تھا؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

''کیا بورے سے تمھیں خدا کا کوئی پیغام نہیں ملا؟''

''بالکل نہیں۔''

خالی بورا چارپائی کے نیچے پڑا تھا۔ دہاڑعلی نے بورا کھینچ کر الٹ دیا تو اس میں سے ایک لفافہ نکلا۔

''شاید نیچے رہ گیا ہوگا!'' نواب صاحب نے لفافہ اٹھاتے ہوئے کہا، ''نظر نہیں آیا۔''

فوراً انھوں نے لفافہ پھاڑ کر خدا کا پیغام پڑھنا شروع کر دیا – میرے پیارے بندے، نواب رنگیلے! ہم نے تمھاری دعا سنی اور ہمارا دل پانی پانی ہوگیا۔ چونکہ تم ہمارے نیک بندے ہو، ہم تمھاری دعا قبول فرماتے ہیں اور تمھارے چناؤ فنڈ میں لاکھ روپے دیتے ہیں۔ لیکن ہماری صرف ایک شرط ہے۔ اگر تم

چناؤ جیت جاؤ تو نگاڑاپور کو طبلا گنج میں شامل کرنے کی پُر جوش کوشش کرنا۔

سارے جہاں کا مالک،

اللہ میاں۔

''کیا خیال ہے، نواب صاحب؟'' دہاڑ علی نے مسکرا کر پوچھا، ''خدا کے حکم کو اب آپ ٹال سکتے ہیں؟''

یہ سن کر نواب صاحب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

''کیوں؟'' دہاڑ علی حیران ہو کر بولا، ''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

نواب صاحب ہنستے ہنستے لوٹنے لگے۔ پھر لوٹتے لوٹتے ہی کہا، ''چٹکلا مزے دار ہے۔''

''چٹکلا؟''

''اور کیا؟ سارے جہاں کا مالک خدا ہے۔ اب اس جہان میں ایک چھوٹا سا گاؤں ادھر رہے یا اُدھر، اس سے اسے کیا فرق پڑتا ہے؟'' یہ کہہ کر وہ پھر ایک بار قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

دہاڑ علی اپنا سر نہ پیٹتا تو اور کیا کرتا؟ لاکھ روپے کا بورا نواب صاحب کے چھپّر سے اسی نے پھینکا تھا۔